اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا شش ماہی ترجمان

(نومبر ۲۰۰۸ء)

اِقبال رِیویو

اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد، انڈیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا شش ماہی ترجمان

(نومبر ۲۰۰۸ء)

برائے تبصرہ

اقبال ریویو

جلد (۱۷) شمارہ (۲)

ISBN No: 81-86370-39-0

اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد، انڈیا

مجلس مشاورت

۱۔ جناب محمد ظہیر الدین احمد
(صدر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد)

۲۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی (لاہور)

مجلس ادارت

۱۔ جناب محمد ضیاء الدین نیر
(نائب صدر اکیڈیمی)

۲۔ سید امتیاز الدین
(معتمد اکیڈیمی و ایڈیٹر)

بدل اشتراک

فی شمارہ ۵۰ روپے
ایک سال کے لیے (دو شمارے) ۹۰ روپے
بیرونِ ملک: فی شمارہ ۵ ڈالر یا متبادل رقم

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :

اقبال اکیڈیمی، گلشن خلیل: 10-5-7/1 تالاب ماں صاحبہ ۔ حیدرآباد۔ 500028

آندھرا پردیش (انڈیا)۔ فون: 66663950

e-mail: ihfiqbal@hotmail.com

کمپیوٹر کمپوزنگ : محمد کلیم محی الدین، افضال الحق ندوی ''شارپ کمپیوٹر'' H.NO.16-8-907/A،
نیو ملک پیٹ، قریب ریلوے اسٹیشن، حیدرآباد 500024۔ فون: 9392427796

سید امتیاز الدین ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے وی جی پرنٹرز لسکھ نگر، حیدرآباد سے طبع کروا کر
اقبال اکیڈیمی حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

عنوان	مضمون نگار	صفحہ نمبر
۱۔ اداریہ	ادارہ	۵
۲۔ یوسف حسین خان کی کتاب ''روح اقبال''	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۷
۳۔ فکر اسلامی کی تشکیل جدید۔ دور حاضر کے عصری تقاضے اور علمائے ہندوستان کا نقطۂ نظر	ڈاکٹر معین الدین عقیل	۲۶
۴۔ اقبال کی ایک معرکتہ الآراء غزل	مصحف اقبال توصیفی	۳۷
۵۔ مسلم طلباء وطالبات کی شخصیت سازی	محمد ظہیر الدین	۴۳
۶۔ مضامین سیرت طیبہ:		
(i) حب رسول ﷺ کے تقاضے	محمد ظہیر الدین	۵۰
(ii) سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰؐ سے مجھے	'' ''	۵۸
(iii) ہجرت آئین حیات مسلم است	'' ''	۶۷
(iv) عبدہٗ ورسولہٗ (صلی اللہ علیہ وسلم)	'' ''	۷۴
۷۔ کیلاش کنول تراجم از پیام مشرق	مقبول احمد پوری	۸۰
۸۔ خبرنامہ	ادارہ	۸۳
۹۔ Some Aspects of Iqbal's Educational Thoughts	ڈاکٹر طارق مسعودی	

○○○

اقبال کے ایک خط سے اقتباس

''علماء میں مداہنت* آ گئی ہے، یہ گروہ حق کہنے سے ڈرتا ہے، صوفیاء اسلام سے بے پروا اور حکّام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آج کل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت اور عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں ہے۔ عوام میں جذبہ موجود ہے، مگر ان کا کوئی بے غرض رہنما نہیں ہے۔''

اقبال کا خط مورخہ ۲۰ر جولائی ۱۹۳۷، اقبالنامہ صفحہ ۲۴۹، بہ نام
چودھری نیاز علی خاں

(*) مداہنت یعنی خوشامد

اداریہ

اقبال ریویو کا تازہ شمارہ آپ کی نذر ہے۔ اس بار ہمارے قارئین مضامین میں ایک طرح کا تنوع محسوس کریں گے۔ پروفیسر محسن عثمانی ندوی نے اقبال اکیڈیمی کے اجتماعات کے لیے اقبالیات پر تقاریر کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ ان کا پہلا خطاب ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب کی معرکۃ الآرا کتاب ''روحِ اقبال'' پر تھا۔ ان کی بصیرت افروز تقریر کو ہم اس شمارہ میں شامل کر رہے ہی۔ ممتاز محقق و نقاد ڈاکٹر معین الدین عقیل وزیٹنگ پروفیسر اوساکا یونیورسٹی جاپان، ماہ مارچ ۲۰۰۸ء میں اقبال اکیڈیمی تشریف لائے تھے اور ''فکر اسلامی کی تشکیل جدید'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا تھا۔ یہ عالمانہ مقالہ بھی اس شمارے میں شامل کیا جا رہا ہے۔ جناب مصحف اقبال توصیفی جدید شاعروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ آپ کی نثر بھی بہت خوبصورت ہے۔ ہماری خواہش پر مصحف اقبال توصیفی نے اقبال کی ایک غزل کا تجزیاتی مطالعہ قلم بند کیا ہے۔

صدر اقبال اکیڈیمی جناب محمد ظہیر الدین نے سیرت النبی ﷺ کے بعض پہلوؤں پر مضامین لکھے ہیں جو یوم رحمۃ اللعالمین ﷺ کے اجتماعات میں کی گئی تقاریر پر مشتمل ہیں۔

ان مضامین میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے اسوۂ حسنہ کو عصر حاضر کے تقاضوں کی روشنی مُں سمجھا جائے تا کہ اس ابدی سرچشمۂ حیات کے زمانی پہلو بھی پیش نظر رہیں۔

ڈاکٹر طارق مسعودی کا مضمون شمارے کے انگریزی حصہ کی زینت ہے۔ ان مضامین کے علاوہ اقبال ریویو کا مستقل فیچر ''خبر نامہ'' ہماری سرگرمیوں کا احاطہ کرتا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ قارئین ہماری کوششوں کو پسند فرمائیں گے اور اپنی رائے سے نوازیں گے۔

(ادارہ)

○

ناپید ہے بندۂ عمل مست
باقی ہے فقط نفس درازی

○

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی

○

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں
فقط یہ بات کہ پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق

اقبالؔ

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

یوسف حسین خان کی کتاب روح اقبال۔ایک مطالعہ

خوبصورت عمارتیں ہزاروں ہوتی ہیں لیکن ہر خوبصورت عمارت تاج محل نہیں ہوتی ہے۔اقبال شناسوں نے اقبال کے فکر وفن پر بہترین کتابیں لکھی ہیں لیکن ہر اچھی کتاب روح اقبال نہیں ہوتی ہے۔کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۲ مین شائع ہوا تھا اور ساتواں ایڈیشن ۱۹۹۸ (طبع ثانی) اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کی طرف سے شائع ہوا۔تاج محل کی طرح اقبالیات کے سات یا سات سے زیادہ اہم عجائبات میں آج تک اس کتاب کا شمار ہوتا ہے۔یعنی اقبال پر مستند معیاری کتابوں کے مطالعہ کا آرزومند اس کتاب سے صرف نظر نہیں کرسکتا ہے۔کتاب کے مصنف ڈاکٹر یوسف حسین خان ہیں۔حافظ اور اقبال، غالب اقبال، فرانسیسی ادب، کاروان فکر، یادوں کی دنیا جیسی اہم کتابوں کے مصنف۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر رہے۔میرے نزدیک تو وائس چانسلر کتنے گورنر اور منسٹر وقت گریزاں کے طاق کا پھول بن کر مرجھا جاتے ہیں۔پھر کوئی ان کا نام بھی نہیں لیتا ہے۔اس سلسلہ روز وشب میں جو نقش گر حادثات ہے اگر کسی شئی کو دوام ہے تو اس فکر وفن کو دوام ہے جس کی نمو خون جگر سے ہوتی ہے۔روح اقبال بھی ایسی ہی کتاب ہے جس میں مصنف کا خون جگر شامل ہے۔

مصنف نے کتاب کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے فن اور شاعری، تمدن اور معاشرت کے بارے میں نظریات اور مذہب اور مابعد الطبیعات سے متعلق افکار، اقبال کی شخصیت اور فکر وفن کی تمام جہتوں کو ان تین ابواب میں سمیٹ لیا گیا ہے۔اس طرح کہ کتاب اقبال کی بہترین ترجمان بن جاتی ہے۔جو کچھ اقبال نے شعر کی زبان میں کہا تھا یوسف حسین خان نے نثر کی زبان میں اس کی توضیح اس طرح کردی ہے کہ اقبال کی عظمت اور انفرادیت اجاگر ہوگئی ہے۔گویا روح اقبال کو نثر میں اس طرح کشید کرلیا گیا ہے کہ کتاب میں اقبال کا بحیثیت فلسفی اور بحیثیت فنکار اور بحیثیت رہنمائے قوم پورا عکس اتر آیا ہے۔

بحیثیت فنکار اقبال نے اپنے تصورات اور خیالات کو اتنے فنکارانہ انداز میں اور لفظوں کے موزوں قالب میں پیش کیا ہے کہ وہ پڑھنے والوں کے روح کے اندر پیوست ہو جاتے ہیں۔ اس عظیم اثر آفرینی کی وجہ وہ بے پایاں خلوص اور سوز ہے جو فنکار کے اندر پایا جاتا ہے۔ یہ نہ نواز کا دل ہے نہ کہ چوب نے جس کا نغمہ آتشیں دل کی گہرائی تک پہونچتا ہے۔ صرف لفظوں کا کارخانہ اور تخیل کا پری خانہ اپنے اندر وہ تاثیر نہیں رکھتا جو ایک خود سوز اور آتش فروز جذبہ رکھتا ہے۔ یہ سوز جگر جب فن کی شیشہ گری سے مل کر شعر کے قالب میں ڈھلتا ہے تو اقبال کی شاعری وجود میں آتی ہے۔ ایسی شاعری جو ساحری بھی کہلاتی ہے اور اگر وہ پیغام کی حامل ہو تو پیغمبری بھی کہلاتی ہے۔ تاثیر کے لئے صرف پیغام اہم نہیں اہمیت اس بات کی ہے کہ پیغام کو لوازم فن کے ساتھ پیش کیا گیا ہے یا نہیں۔ فن اگر نہ ہو تو بہت سے پیغام سودائے خام اور کارنامے تمام بن جاتے ہیں اور فن کی آرائش اگر موجود ہو تو فکر ناتمام کو بھی قبول عام حاصل ہو جاتا ہے۔ مقصود اصلی اگر چہ فکر ہے لیکن فکر اکثر نامقبول اور ناکام ہو جاتی ہے اگر اس کے ساتھ فن کا قرینہ شامل نہ ہو۔ تاثیر کیلئے یہ بات کم اہم ہے کہ فکر کیسی ہے موضوع کیا ہے۔ طرز ادا کی اہمیت زیادہ ہے۔ اعلیٰ درجہ کے ادب کی تخلیق کیلئے موضوع اور ہیئت دونوں کی بلندی اور خوبصورتی درکار ہے۔ ایک فنکار زندگی کی حقیقی تجربوں پر اپنی تخیل کی بناء رکھتا ہے وہ کتاب میں پڑھی ہوئی باتوں اور سنی سنائی ہوئی حکایتوں کی زمین پر تخیل کی عمارت نہیں تعمیر کرتا ہے۔ وہ اپنے واردات قلبی کا اظہار فن کے پر تاثیر پیرایہ بیان کے ذریعہ کرتا ہے۔ اس کا خلوص اس کے لفظوں میں زندگی کی روح پھونکتا ہے۔ لفظ میں جان پڑ جاتی ہے۔ ہر لفظ ایک دل بیتاب کے مانند دھڑکنے لگتا ہے۔ یہ بھی ایک تخلیقی عمل ہے۔ خالق انس وجن نے خاکے بے جان پتلے کو ایک پھونک سے جان دار بنا دیا تھا خالق شعر و فن لفظوں کے سلسلے کو اپنی ترتیب خاص سے اور سوز باطن سے بامعنی اور باحیات بناتا ہے۔ اقبال کے نزدیک تخلیق دونوں جگہ مشترک ہے۔ سفال آفریدی ایاغ آفریدم۔

یوسف حسین کہتے ہیں۔ اقبال کے فن کی تخلیق میں مصوری کو بھی اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ مثال کے طور پر نظم بزم انجم میں مصوری اپنے کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ بے جان اشیاء کو ذی روح کی شکل میں پیش کیا گیا ہے جسے Personification کہتے ہیں۔ منظر یہ ہے کہ سورج شام کو رخصت ہو رہا ہے اور شام نے اندھیرے کی قبا زیب تن کر لی ہے۔ طشت افق ایک استعارہ ہے

جس میں بوقت شام لالے کے پھول رکھے ہوئے ہیں اور سورج اس طشت افق سے لالے کے پھول لے کر شام سیہ قبا پر بے تکلفی سے ڈال رہا ہے۔ سورج کی رشنی میں نہائی ہوئی کائنات قدرت اب روشنی سے باہر نکل رہی ہے گویا قدرت اپنے چاندی کے زیور اتار رہی اور فشاں شفق سون کے گل رنگ زیور کو ہسار و مرغزار کو طوبیٰ کی شاخ کو اور کوہ و کاخ کو پہنا رہی ہے۔ محمل شب میں لیلائے ظلمت داخل ہو رہی ہے آسمان میں عروس شب کے موتی یعنی ستارے اب جگمگانے لگے ہیں۔

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبول کو
طشت اق سے لے کر لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور
قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے
محمل میں خاموشی کے لیلائے ظلمت آئی
چمکے عروس شب کے موتی وہ پیارے پیارے

تشبیہیں نادل اور لطیف ہیں ان میں بلاغت ہے حسن ہے اور طرفگی ہے۔ اسی طرح نظم ایک آرزو میں پرسکون زندگی کی خواہش ہے۔ منظر نگاری اور مرقع سازی غضب کی ہے۔ ایک ندی بہ رہی ہے دونوں جانب صف باندھے ہوئے پوٹے اور شاداب پیڑ پودے ہیں۔ نظارہ اتنا دلفریب ہے کہ پانی موج بن گراٹھ اتھ کر دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ابلتی اور اچھلتی ہوئی موجوں کی یہ تشبیہ بہت حیران کنہے۔ گل کی ٹہنی پانی کو چھو رہی ہے جیسے کوئی حسین آئنہ دیکھتا ہے۔ آرزو کی عکاسی میں کمال فنکاری کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ مصوری کا فن اور منظر کشی کا کمال نظم بعنوان کشمیر میں اپنے عروج پر نظر آتا ہے لفظوں کے طلسم سے فطرت کی تصویر کھینچی گئی ہے۔

رخست بکاشمر کشا کوہ وتل ودمن نگر
سبزہ جہاں جہاں نبیں لالہ چمن چمن نگر

کتاب میں یوسف حسین خان نے منظر نگاری کے بہترین نمونے جمع کر دیئے ہیں۔ قندھار کی سرزمین کے بارے میں جو اشعار ہیں ان میں ملک قندھار کے سکون اور سناٹے اور چوٹیوں کی بلندی کی تصویر کھینچنے کے لئے مناسب بحر اور ردیف اور قافیہ کا استعمال کیا گیا ہے۔

رنگ ہا بو ہا ہوا آب ہا
آب ہا تابندہ چوں سیماب ہا
لالہ ہا در خلوت کہسار ہا
نار ہا نخ بستہ اندر نار ہا

تشبیہات کی طرفگی اور ندریت کا بہترین نمونہ نظم جگنو میں ملتا ہے کبھی اسے شمع سے تشبیہ دی گئی ہے جو پھولوں کی انجمن میں جل رہی ہے، کبھی اسے آسمان سے اڑکر آنے والا ستارہ قرار دیا گیا ہے، پھر اسے مہتاب کی کرن سے تشبیہ دی گئی ہے جس میں جان پڑ گئی ہے۔ اسے شب کی سلطنت میں دن کا سفیر ٹھہرایا گیا ہے اور مہتاب کی قبا کا تکمہ۔ اسی طرح نظم ''شاعر'' میں منظر نگاری اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔

جوئے سرور آفرین آتی ہے کوہسار سے
پی کے شراب لالہ گوں میکدہ بہار سے
پھرتی ہے وادیوں میں کیا دختر خوشش خرام ابر
کرتی ہے عشق بازیاں سبزہ بہار سے

یوسف حسین خان صاحب نے منظر نگاری اور مصوری میں اقبال کے فن کی تمام خصوصیات تفصیل کے ساتھ پیش کی ہیں اور اقبال کی عظمت شاعرانہ پورے طور پر سامنے آجاتی ہے۔ صوتی محاکمات کے لئے ''ایک شام'' کے عنوان سے جو نظم ہے پیش کرنے کے بعد اس کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ حرف شین کی تکرار نے خاموشی کے منظر کو آنکھوں کے سامنے مجسم کر دیا ہے۔

اقبال کے فن کے تصور میں جمالی اور جلالی دونوں عنصر شامل ہیں اور دونوں ضروری ہیں اور دونوں کے امتزاج سے فن پیغمبری سے قریب ہونے لگتا ہے۔

دلبری ہے قاہری جادوگری است
دلبری با قاہری پیغمبری است

اقبال کی غزلیں بھی فن کی بلندیوں پر ہیں۔ صرف عشق و محبت کی معاملہ بندی نہیں ہے بلکہ اس میں مقصد پسندی اور اجتماعی قوت و تازگی کا اظہار ملتا ہے۔ اس میں جہان معانی ملتا ہے۔ یہ وہ

چیز ہے جو روایتی غزلوں میں نہیں ملتی ہے۔ اقبال کی غزلوں میں جوش بیان بھی ہے اور رمزیت بھی ہے۔ وہ حسن ادا کے جادو سے ذہنوں کو مسحور کر دیتے ہیں اور اپنے نفس گرم سے رمز میں جان ڈال دیت ہیں اور استعاروں کو ستاروں کی بلندی تک پہونچاتے ہیں۔

میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی

اقبال نے مسلسل نظم نما غزلیں بھی کہی ہیں جن کی وجہ سے غزل نیم وحشی صنف غزل نہیں رہی۔ اس میں غزل کی رعنائی موجود ہے اور فکر کی زلف مسلسل بھی جو نظم کا شیوا ہے۔ مثال کے طور پر

دریا میں موتی اے موج بے باک
ساحل کی سوغات ،خاروخس وخاک
میر شرر میں بجلی کے جوہر
لیکن نیستاں تیرا ہے نمناک
تیرا زمانہ تاثیر تیری
ناداں نہیں یہ تاثیر افلاک
ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے
جس نے سیے ہیں تقدیر کے چاک
کامل وہی ہے رندی کے فن میں
مستی ہے جس کی بے منت تاک
رکھتا ہے اب تک میخوانہ شرق
وہ مئے کہ جس سے روشن ہوادراک

اقبال نے غزلوں کو تسلسل کے علاوہ نئے معانی سے روشناس کرایا ہے اور اس کو روایتی ڈگر سے ہٹایا ہے یہ غزل دیکھئے

کیا عشق ایک زندگی مستعار کا

کیا عشق پائیدار سے ناپائیدار کا
وہ عشق جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک
اس میں مزا نہیں تپش وانتظار کا
میری بساط کیا ہے تب وتاب یک نفس
شعلہ سے بے محل ہے الجھنا شرار کا
کر پہلے مجھ کو زندگی جاوداں عطا
پھر شوق وذوق دیکھ دل بے قرار کا
کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لا زوال ہو
یارب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

فکر مسلسل اور نئے معانی سے لبریز یہ غزل بھی ہے جس کے چند شعر یہ ہیں۔

دل مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرض کہن کا چارہ
تا بحر پرسکوں ہے یہ سکوں ہے یا فسوں ہے
نہ نہنگ ہے نہ طوفاں نہ خرابی کنارہ

روح اقبال میں اس طرح کی کئی نظمیں جمع کر دی گئی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس قدر ان میں جوش بیان ہے لفظوں کا شگفتہ اور شاداب چمن عنادل کے ساتھ کس قدر موسیقی ریز ہے اور اس پر رفعت فکر ومعانی جو پہلے کے غزل گو شعراء کے حاشیہ خیال میں بھی موجود نہ تھے۔ اقبال نے غزل کی کائنات کو کس قدر وسعت دی اور کس طرح ایک جوئے کم آب کو متلاطم دریا بنا دیا ہے۔ روح اقبال کی غزلوں کے فکر انگیز معانی کے لئے متحرک تصورات کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ چند مزید اشعار غزل کی معنی خیزی اور تاب وتب کی دل سوزی کے ثبوت کے طور پر پیش ہیں

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ

کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں
نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو تیرے عفو بندہ نواز میں
نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں
جو میں سربسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

یوسف حسین خان نے روح اقبال میں صفحات کے صفحات سیاہ کر دیئے ہیں یہ ثابت کر نے میں کہ اقبال فلسفی ضرور ہیں لیکن ان سے غزل کی آبرو بھی قائم ہے انہوں نے غزل کے معانی کو بے کرانی عطا کی ہے۔ اقبال نے افکار و معانی کی بلندی کو بعض مقامات پر اتنی سادہ زبان عطا کی ہے کہ اس سے سادہ زبان کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

روح اقبال کا دوسرا باب ''اقبال کے فلسفہ تمدن'' سے متعلق ہے اور اقبال کے فکر و فلسفہ کو سمجھنے کیلئے یہ باب بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ روح اقبال کا پہلا باب اقبال کی شاعری اور فن کی تفصیلات کے بارے میں تھا اسے اولیت اس لئے دی گئی تھی کہ اقبال کے تمام تصورات اور افکار و معانی کے اظہار و ابلاغ کے لئے فن ہی واسطہ اور وسیلہ ہے۔ افکار کی مقبولیت اور اس کا خیر مقدم فن کار ہین منت ہے۔

اس باب میں یوسف حسین خان نے سب سے پہلے اقبال کے فلسفہ خودی سے بحث کی ہے۔ اقبال کے نزدیک زندگی کا اصل محرک اثبات خودی کا جذبہ ہے جو انسان میں ودیعت ہے یہ خودداری بھی ہے خود شناسی بھی ہے اور خود کشائی بھی۔ یہ عرفان نفس کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔ یہ عرفان نفس جدوجہد کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ زندگی ایک مسلسل حرکت ہے جو نت نئی خواہشوں کی

تخلیق کرتی اور اس طرح اپنی توسیع اور بقاء کا انتظام کرتی ہے۔ وہ پیہم عمل اور کشمکش سے لازوال ہو جاتی ہے۔

خودی کیا ہے راز درون حیات
خودی کیا ہے بیداری کائنات
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
زمانے کے دھارے میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر

انسانی خودی مثل سمندر کے ہے جس کا اور چھور نہیں۔ اس کی وسعتیں اتنی ہیں جتنی انسان کی ہمت۔ اس خیال کو اس شعر میں پیش کیا گیا ہے۔

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آب جو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

پھر اقبال کہتے ہیں کہ ''خودی از کائنات رنگ و بو نیست'' ہمارے ظاہری حواس خودی نہیں دیکھ سکتے اس کا پتہ صرف وجدان سے چلتا ہے۔ خودی کے احساس کی ابتداء اس شعور سے ہوتی ہے کہ وہ ہے۔ انسانی خودی حوادث اور اعمال کے نظام نئے عبارت ہے۔ خودی کا ارتقاء خارجی عالم کے توسط سے ہوتا ہے۔ خودی اقبال کی شاعری اور فکر کا کلیدی لفظ ہے۔ انسانی خودی میں ابدی زندگی کی تمام ممکنات موجود ہیں۔ ارتقاء کا دار مدار اسی پر ہے۔ اسی کو اقبال عشق اور شوق کہتا ہے اس طرح خودی اور عشق ایک دوسرے سے وابستہ اور پیوستہ ہو جاتے ہیں۔ خودی الوہیت کا مظہر ہے۔ عالم فانی ہے لیکن خودی باقی اور غیر فانی ہے۔ اقبال نے فوق البشر کے تصور کو مشرف با سلام کیا۔ خودی کے وجود کا انحصار ذات باری پر ہے جو کائنات کی خالق ہے۔ اقبال کے فلسفہ خودی کو توازن کے ساتھ سمجھنا اور توازن کے ساتھ پیش کرنا دونوں مشکلات اقبال میں سمجھے جاتے ہیں۔ اقبال ایک طرف خودی کے استقلال اور استحکام کے قائل ہیں دوسری طرف اس میں

بے خودی اور شکست خوردگی کی کیفیت پیدا کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ خودگری خودنگری اور خودشکنی خودی کی واضح منزلیں ہیں۔

نعرہ زد عشق کے خونیں جگرے پیداشد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور
خود گرے خود شکنے خود نگرے پیداشد

خودی کیلئے طاقت اور توانائی کے ساتھ ساتھ ربودگی اور خودشکستگی دونوں ضروری ہے۔

تو بچابچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

اقبال نے اپنے ایک خط میں خودی کی توضیح کی ہے۔ حدود خودی کے تعین کا نام شریعت ہے اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے۔ (اقبال نامہ ص ۲۰۳ بحوالہ روح اقبال ص ۱۳۹) اقبال کے نزدیک جو چیز خودی کو قوت بخشتی ہے وہ خیر ہے اور جو اسے کمزور کرتی ہے وہ شر ہے۔ خودی کا عرفان ضروری ہے اس کے بغیر بشر عظمت حاصل نہیں کرسکتا۔

ہر چیز ہے محو خود نمائی
ہر ذرہ شہید کبریائی
بے ذوق نمود زندگی موت
تعمیر خودی میں ہے خدائی
رائی زورِ خودی سے پربت
پربت ضعف خودی سے رائی
اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں
باقی ہے نمود سیمیائی

روح اقبال میں خودی کے فلسفہ کا بیان بہت تفصیل سے ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ اقبال کے نزدیک فن اور تہذیب کی تخلیق بھی خودی کی مرہون منت ہے۔ اگر کسی تہذیب میں تخلیق کی صلاحیت کمزور ہوجائے تو بہت جلد مٹ جاتی ہے۔ تخلیق کا محرک عرفان ذات ہے۔ بالفاظ

دیگر اقبال کے نزدیک مشرق کی تخلیقی صلاحیت اگر مردہ ہو جائے اور اس میں زندگی کی صلاحیت باقی نہ رہے وہ اس عالم ایجاد میں صاحب ایجاد نہ بن سکے اس میں فائدہ پہونچانے کی صلاحیت نہ ہو تو اس کا باقی رہنا مشکل ہے۔ اقبال کہتے ہیں۔

جہاں تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم وہمت نے ،
اس آبجو سے کئے بحر بیکراں پیدا
وہی زمانہ کی گردش پہ غالب آتا ہے ۔
جو ہر نفس سے کرے عمر جاوداں پیدا
خودی کی موت سے مشرق کی سرزمینوں میں
ہوا نہ کوئی خدائی کا رازداں پیدا

مصنف نے مختلف طریقوں سے خودی کی تشریح کی ہے وہ کہتے ہیں کہ اقبال کے نزدیک خودی اور زندگی مترادف ہیں۔ خودی ذوق تسخیر کا نام ہے۔ یہ برگ گل بھی ہے تلوار بھی ہے۔ ذوق خود آگہی ہے۔ اسی سے آتش طلب کی حرارت تیز ہوتی ہے پھر انہوں نے اقبال کے اشعار نقل کئے ہیں۔

سرور شعر وسیاست کتاب ودین وہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیر بندہ خاکی س ہے نمودان کی
بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ
اگرخودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کرسکیں تو سراپا فسون وافسانہ
ہوئی ہے زیر فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب ودیں ہوئے ہیں بیگانہ

ڈاکٹر یوسف حسین خان نے روح اقبال میں اقبال کے فلسفہ اجتماعی طور پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور یہ حصہ کتاب کے اہم ابواب میں ہے۔ کوئی مفکر ہو اور کسی زمانہ کا ہو کسی قوم اور نسل کا ہو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی زلف برہم اور اس کے پیچ وخم سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔ انسانی زندگی اس کے سوا ہے بھی کیا۔ جس طرح انسان دنیا یں صبح وشام اور لیل ونہار کا عادی ہوتا ہے اسی میں وہ کچھ انفرادی زندگی رکھتا ہے اور کچھ اجتماعی۔ کبھی اس را نفرادی زندگی غالب رہتی ہے اور کبھی اجتماعی۔ لیکن اس کا واسطہ ان ہی دو پہلوؤں سے رہتا ہے۔ فلسفیوں میں بھی ذہنی رجحانات الگ ہیں۔ کانٹ فشٹے اور برگسوں زندگی کے انفرادی پہلو زیادہ موئید ہیں لیکن حیات اجتماعی کا انکار کسی نے کیا ہے۔ انسانی زندگی ایک گوہر کے مانند ہے یہ حیات انفرادی ہے لیکن یہ گوہر صدف میں پرورش پایا ہے۔ صدف استعارہ ہے گرد پیش کے ماحول کا۔ پھر اس صدف کا تعلق سمندر کی پہنائیوں سے ہے۔ یہ وسیع تر حیات اجتماعی کا عکاس ہے۔ گویا گوہر زندگی کی پرورش ماحول اور معاشرہ میں ہوتی ہے اسی طرح انسانی زندگی اپنی تمام تر انفرادیت کے باوصف حیات اجتماعی سے دامن کشن نہیں۔ اقبال احساس خودی کا شاعر ہے یعنی اس کے نزدیک انفرادیت زندگی کا بہت اہم نکتہ ہے یہی وہ نقطہ ہے جس سے اجتماعی زندگی کی تمام زاوئے نکلتے ہیں، جس طرح سے روشنی کا ایک منبع ہوتا ہے لیکن روشنی اپنے منبع سے نکل کر چار سو پھیل جاتی ہے اور گرد وپیش کو منور کر دیتی ہے اسی طرح خوی پوری حیات اجتماعی کو منور اور تابناک کر دیتی ہے۔ فرد بغیر تمدن کے مکمل نہیں ہوتا ہے۔ ذمہ داری اور فرض کا احساس تمدن کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس بات کو اقبال اپنے شعر میں یوں کہتے ہیں۔

وجود افراد کا مجازی ہے ہستی ہر قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زن طلسم مجاز ہو جا

اقبال نے فلسفہ خودی کی طاقتور ترجمانی کے باوصف ہر جگہ حیات اجتماعی کی اہمیت پر زور دیا ہے اور فرد کو ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھنے کی تاکید کی ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاننے چن

چن کر یہ اشعار نقل کئے ہیں، انہوں نے اقبال کی یہ نظم ثبوت کے طور پر پیش کی ہے۔

ڈالی گئی جو فصل خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحاب بہار سے
ہے لازوال عہد خزاں اس کے واسطے
کچھ واسطہ نہیں اسے برگ وبار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصل خزاں کا دور
خالی ہے جیب گل زر کامل عیار سے
جو نغمہ زن تھ خلوت اوراق میں طیور
رخصت ہوئے ترے شجر سایہ دار سے
شاخ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو
ناآشنا ہے قاعدۂ روزگار سے
ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوسہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

ملت اور حیات اجتماعی فرد اور فرد سے مل کر بنتی ہے لیکن حیات اجتماعی کی عمر فرد کی مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوتی ہے ملت کی تقویم فرد کی تقویم سے جداگانہ ہے۔ خم ایام سے روز وشب کے انگنگ جام میخواران حیات کو ملتے ہیں لیکن خم کی مئے اس سے کم نہیں ہوتی ہے۔

صبح از مشرق ز مغرب شام رفت
جام صد روزانہ خم ایام رفت
بادہا خوردند وصہبا باقی است
دوش ہا خون گشت وفردا باقی است

یوسف حسین خان نے اقبال کے حیات اجتماعی کے فلسفہ کی تشریح کی ہے وہ لکھتے ہیں، ہم عالم گیر مقاصد تک جماعتی زندگی کی توسط سے پہونچتے ہیں جن سے ہمارا مل بامعنی بنتا ہے ہمارے اعمال اور عزم کے نتائج ہی سے اخلاقی قدریں پیدا ہوتی ہیں جن سے زندگی کو توازن اور ہم آہنگی نصیب ہوتی ہے۔ یوسف حسین خان نے اقبال کے تصور خودی اور تصور اجتماعیت دونوں کو تعلیم

اسلام سے مربوط کردیا ہے اقبال نے ان رجحانات کو اجاگر کیا ہے جو اسلامی تہذیب میں پہلے سے موجود رہے ہیں۔

فرد را ربط جماعت رحمت است
جوہر اور را کمال از ملت است

یوسف حسین خان نے بڑے توازن سے اقبال کے فلسفہ انفرادیت اور اجتماعیت پر روشنی ڈالی ہے وہ کہتے ہیں کہ اسی توازن میں اقبال کی عظمت چھپی ہوئی ہے وہ کہتے ہیں کہ انسان کی تمام تر کامیابیاں اور جدت طرازیاں انفرادی قوت تخلیق اور خودی میں چھپی ہوئی ہیں۔ اپج اور جدت طرازی خالص انفرادی صلاحیت ہے، جماعت تخلیق نہیں کرسکتی ہے وہ استفادہ کرسکتی ہے۔ لیکن ارسطو کا یہ کہنا اپنی جگہ درست ہے کہ انسان سوشل انیمل یعنی سماجی جانور ہے۔ فرد کی بقا ملت کی بقا پر منحصر ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

حیات اجتماعی اور اس کے پہلوں پر یوسف حسین نے خان نے عمیق اور دقیق بحث کی ہے قوموں کا عروج وزوال اسی فلسفہ سے متعلق ہے قوموں کے عروج واقبال اور انحطاط وزوال کا تعلق انسان کی حیات اجتماعی سے ہے پروفیسر یوسف حسن خان نے کلام اقبال کی روشنی میں عروج وزوال کا جو فلسفہ پیش کیا ہے وہ بہت اہم ہے پوری کتاب میں کچھ نہیں ہوتا صرف یہ حصہ ہی موجود ہوتا تو کتاب اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ کتابوں کی ہجوم میں چمکتی اور اپنی اہمیت منواتی۔

کتاب کا سب سے اہم اور قابل غور حصہ حیات اجتماعی کے باب اور فلسفہ تمدن سے متعلق ہے جس کو اس اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل ہے کہ مسلمانوں کے زوال کے اسباب کو سمجھنے میں اس سے مدد ملتی ہے اور مستقبل کی حکمت عملی بھی سمجھ میں آتی ہے۔ استدلال قرآن کی آیتوں سے بھی کیا گیا ہے اور اقبال کے اشعار سے بھی۔ قرآن میں ایمان اور عمل صالح کی شرط پوری ہونے پر ''تمکین فی الارض'' کا وعدہ کیا ہے۔ مصنف کے نزدیک ایمان سے مراد ہے مقصد زندگی پر یقین اور عمل صالح سے مراد ہے طبعی قوتوں کو مسخر کرنا۔ اگر طبعی طاقتوں کا جن شیشہ میں بند کردیا جاتا ہے

اور نوامیس قدرت کو مسخر کر دیا جاتا ہے تو یہ ایک طاقت کے حصول اور غلبہ کا ذریعہ ہے اور یہی عمل صالح ہے۔ عمل صالح سے مراد خاک کی آغوش، تسبیح و مناجات نہیں ہے۔ اقبال کے فلسفہ عروج و زوال پر بحث کے دوران وہ اقبال کے خطبات کے حوالے دیتے ہیں مثلاً یہ اقتباس انہوں نے پیش کیا ہے۔

''جس طرح ایک جسم ذوی الاعضاء مریض ہونے کی حالت میں بعض دفعہ خود بخود بلا علم و ارادہ اپنے اندر ایسی قوتوں کو برانگیختہ کر دیتا ہے جو اس کی تندرستی کا موجب بن جاتی ہے اسی طرح سے ایک قوم جو مخالف قوموں کے اثرات سے سقیم الحال ہوگئی ہو بعض دفعہ خود بخود ردعمل کرنے والی قوتوں کو پیدا کر لیتی ہے مثلاً قوم میں کوئی زبردست دل و دماغ کا انسان پیدا ہو جاتا ہے یا کوئی نئی تخلیق نمودار ہوتی ہے یا ایک ہمہ گیر مذہبی اصلاح کی تحریک بروئے کار آتی ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ قوم کے قوائے ذہنی و روحانی تمام طاغی اور سرکش قوتوں کو اپنا مطیع و منقاد بنانے اور اس مواد کو خارج کر دینے سے جو قوم کی نظام جسمانی کیلئے مضر تھا قوم کو نئے سرے سے زندہ کر دیتے ہیں اور اس کی اصلی توانائی اس کی اعضاء میں عود کر آتی ہے اگر چہ قوم کی ذہنی و دماغی قابلیت کا دھارا افراد ہی کے دماغ سے ہو کر بہتا ہے لیکن پھر بھی قوم کا اجتماعی نفس ناطقہ جو مدرک کلیات و جزئیات اور خبیر و مرید ہے بجائے خود ضرور موجود رہتا ہے۔

اس ضمن میں اقبال کا یہ بھی خیال ہے کہ جب کسی گروہ میں اجتماعی خودی کا احساس باقی نہیں رہتا تو وہ کسی دوسری جماعت میں جو اس سے زیادہ جاندار اور قوی سیرت کی مالک ہوتی ہے ضم ہو جاتی ہے یا اس کی غلام بن جاتی ہے چونکہ تنہا زندگی کے انقلابوں اور کشمکش کا مقابلہ کرنے کی اس میں سکت باقی نہیں رہتی اور اس کی قوائے عملیہ بالکل شل ہو چکے ہوتے ہیں اس لئے وہ دوسروں کی دست نگر ہو جاتی ہے اور اپنی جماعتی انا کھو دیتی ہے۔ اپنے آئین ملت کے دامن کو مضبوطی سے پکڑنا اور بے ضرورت دوسروں کی تقلید سے گریز اپنے تشخصات کی حفاظت قوموں کے لئے ضروری ہے۔ دوسروں کی تقلید صرف مفید علم و حکمت میں ہونی چاہئے نہ کہ تہذیب کے سطحی مظاہر میں۔ بے ضرورت غیر مفید چیزوں کی نقل احساس کمتری کی دلیل ہے اور جو قوم احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہے وہ دوسری قوم میں ضم ہو جاتی ہے یا اس کی غلام بن جاتی ہے۔

اقبال کا فلسفہ عروج و زوال یوسف حسین خان کی نثر میں آ کر زیادہ آسان اور عام انسان

کی دسترس میں آ گیا ہے۔ یوسف حسین خان لکھتے ہیں۔

''اقبال نے قوموں کی عروج وزوال کے ضمن میں جو اشارے دئے ہیں وہ بڑی حد تک قرآنی تعلیمات سے ماخوذ ہیں قرآن پاک میں مختلف قوموں کے احوال وقائع اس لئے بیان کئے گئے ہیں تا کہ ان سے عبرت اور بصیرت حاصل ہو۔ بصیرت بتاتی ہے کہ جس طرح فطرت کے قوانین کائنات ہستی کے ہر گوشہ میں جاری اور ساری ہیں اسی طرح انسانی اعمال کے بھی الٰہی قوانین ہیں جو ہر زمانہ میں یکساں طور پر اپنے نتائج واثرات پیدا کرتے رہتے جب ان قوانین کے مطابق عمل کیا جاتا ہے تو زندگی کو عروج اور سرفرازی نصیب ہوتی ہے۔ اور جب کبھی ان کی خلاف ورزی ہوتی ہے تو قومیں ذلت اور رسوائی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ قوموں کی سرگذشت سے یہ حقیقت بے نقاب ہے کہ جب تک وہ ''عمل صالح کرتی رہیں انہیں غلبہ اور استیلا رہا لیکن جب وہ بے عملی کے ہاتھوں عیش وعشرت میں پڑ گئیں اور حدود فطرت اور حدود الٰہی سے تجاوز کرنے لگیں تو بہت جلد انہیں اپنی عظمت اور شوکت کی گدی کسی دوسری تازہ دم اور سرگرم عمل قوم کے لئے خالی کر دینی پڑی۔ یہ نئی جماعت پرانے تمدن کے مادی اور ذہنی سرمایہ پر قبضہ کرتی اور زندگی کا نیا ڈول ڈالتی ہے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ یہ کائنات انسان کے لئے ہے اور جب انسان اس کائنات کے پوشیدہ اسرار تک پہونچتا ہے تو اس کے دست تصرف میں طاقت کا خزانہ آجاتا ہے قرآن میں ہے۔ وسخر لکم مافی السموات ومافی الارض جمیعا۔ جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے وہ سب تمہارے تابع فرمان ہے۔ چنانچہ روح ارضی آدم کا استقبال کرتے ہوئے کہتی ہے۔

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحراء یہ سمندر یہ ہوائیں
تھی پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ
سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحر تخیل کے کنارے

پہونچیں گے فلک تک تری آنکھوں کے اشارے
تعمیر خودی کر اثرِ آہ رسا دیکھ
خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں
اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ

انسان کو دنیا میں خلافت ارضی عطا کی گئی ہے۔ یوسف حسین خان نے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ ''دنیا میں نیابت الٰہی ان قوموں کو ملتی ہے جو اپنے فکر و عمل اور جذب و تسخیر کی اہلیت سے اپنے آپ کو اس کا مستحق ثابت کر دیتی ہیں یہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی غیر مستحق جماعت کو غلبہ اور استیلا حاصل ہوا اور اس کو تمکن ارضی کی ذمہ داری سپرد کر دی گئی ہو یہ ذمہ داری صرف اس گروہ کو ملتی ہے جو اپنے عمل کا حساب دینے کو تیار ہو۔

صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں روح عمل کا حساب

قرآن میں ''استخلاف فی الارض'' کی شرط عمل صالح ہے ''ان الارض للہ یرثہا من عبادی الصالحین'' بیشک زمین صالح بندوں کی میراث ہے۔ یوسف حسین خان عمل صالح کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں ہی۔ صرف وہی قومیں دوسروں پر تفوق اور اقتدار حاصل کر سکتی ہیں جنہوں نے اپنے عمل صالح سے اپنے آپ کو نیابت الٰہی کا مستحق ثابت کر دیا ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ عمل صالح سے کیا مراد ہے۔ عمل صالح سے ایسے انسانی اعمال مراد ہیں جو زندگی کو فروغ دینے والے، اس کے ممکنات کو اجاگر کرنے والے، اور قافلہ حیات کو آگے بڑھانے والے ہوں۔

مصنف روح اقبال کا کہنا ہے کہ تاریخ میں اسلامی مفکروں نے جزئیات کے تجربے اور مشاہدے کو خاص اہمیت دی تھی اور استقرائی منطق کو علم حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا تھا۔ اس نئے نظام استدلال سے خود اعتمادی پیدا ہوئی اور کاروان علم کی پیش رفت شروع ہوئی اور جدید سائنس کی بنا ڈال دی گئی۔ ایجاد اور تسخیر فطرت کے لئے صرف تصوراتی اور نظریاتی منطق کافی نہیں۔

استقراء اور تجربہ اور مشاہدہ کی بدولت مسلمان دور سائنس کی قیادت کرنے والے تھے اس کا اعتراف فرانسس بیکن اور دوسرے مغربی دانشوروں نے بھی کیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں۔

حکمت اشیاء فرنگی زاد نیست
اصل او جز لذت ایجاد نیست
نیک اگر بینی مسلمان زادہ است
ایں گہراز دست ماافتادہ است
ایں پری از شیشہ اسلاف ماست
باز صیدش کن او از قاف ماست

یوسف حسین خان مزید یہ لکھتے ہیں کہ ''اب اگر اسلامی ملک اور دوسری ایشیائی قومیں اپنے علم وعمل کو زندگی کی ترقی کیلئے وقف کردیں تو ان کی محرومی اور نامرادی دور ہوسکتی ہے، سوائے اس کے دنیا کی قوموں میں عزت اور وقار حاصل کرنے کی اور کوئی تدبیر نہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ بہت سے انقلابات دیکھ اور جھیل چکی ہے اگر اب بھی وہ عمل صالح کی کسوٹی پر پورے اترنے کی کوشش کریں تو اپنی گذشتہ عظمت کو حاصل کرسکتے ہیں۔

یوسف حسین خان کی توازن فکر کی بات یہ ہے کہ انہوں نے عمل صالح کی تعریف وتشریح میں روحانی تزکیہ اور اخلاقی قوانین کا انکار نہیں کیا ہے لیکن صرف روحانی تزکیہ ان کے نزدیک عمل صالح کا احاطہ نہیں کرتا۔ یہی فرق ہے جو خانقاہوں اور مدرسوں اور بعض دینی جماعتوں کے طرز فکر سے روح اقبال کے مصنف کو ممیز اور ممتاز کرتا ہے۔ یوسف خان کے نزدیک خلوت وخانقاہ کا عمل صالح سکون آفرینی اور جمود کے مماثل ہے۔ یوسف حسین خان کہتے ہیں کہ تزکیہ نفس کے ساتھ عمل صالح کے لئے یہ بھی ضروری ہے اعمال الٰہی اور فطرت کا علم حاصل کیا جائے کہ بغیر اس کے عمل غیر مؤثر ہوگا۔ قرآن پاک میں انسانی شرف کی بنا حقائق اشیاء کے علم کو بالفاظ دیگر سائنس کو ٹھہرایا گیا ہے۔ وعلم آدم الاسماء کلہا۔ اور سکھائے آدم کو نام (خواص) سب چیزوں کے۔ یوسف حسین خان کہتے ہیں کہ اس آیت شریفہ میں اسی جانب اشارہ ہے۔ خدا کو یقیناً ان عبادات اور مذہبی رسوم کی ضرورت نہیں جو بے عملی کا سکون پیدا کریں۔ اقبال کے عمل صالح کے تصور میں تسخیر فطرت شامل ہے۔ تسخیر فطرت کی بدولت انسان حقیقی آزادی کا مزہ چکھ سکتا ہے اور جدت کی صلاحت کو ظاہر کر

سکتا ہے۔ وہ اپنے علم کی قوت سے آسمانوں کے سینے شگاف کرتا اور جہانِ چارسو پر اپنے بے پناہ عمل کا سکہ بٹھاتا ہے۔

اقبال کے نزدیک مغرب نے فطرت کا علم حاصل کیا اور اسی لئے اسے غلبہ حاصل ہوا لیکن مغرب کی غلطی یہ ہے کہ اس نے عقل کو بے لگام اور بے زمام چھوڑ دیا اگر عقل کو وجدان کی صحیح رہبری نہیں ملے تو اس کا توازن باقی نہیں رہتا۔ اقبال کے نزدیک یورپ کی زندگی کا حرکی عنصر اور ان کی سائنٹیفک ایجادات جو تسخیر عالم کی ضامن ہیں قابل تعریف ہیں۔ اقبال نے تمدن کے ظاہری طمطراق کی مذمت کی ہے جو حدود اعتدال سے متجاوز ہوگئی ہیں۔ اقبال کے نزدیک جب تک علم اور عقیدہ کا امتزاج نہ ہو صالح تمدن نہیں پیدا ہوسکتا ہے۔ اقبال نے کہا۔

یورپ میں بہت روشنی علم وہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمہ حیواں ہے یہ ظلمات
بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق ومغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

اقبال کے فلسفہ تمدن کے ضمن میں اقتدار، حکومت جمہوریت، وطنیت، دین وسیاست کی علیحدگی، معاہدہ عمرانی اور اسلام کا نظام حکومت ومعیشت یہ سارے چیزیں فلسفیانہ اور مفکرانہ انداز میں زیر بحث آگئی ہیں۔ آدمی صرف اقبال کے کلام سے آشنا نہیں ہوتا ہے بلکہ دور جدید کے اہم ایشوز پر بصیرت مندانہ اور دانشورانہ باتیں پڑھتا اور سیکھتا ہے۔ اقبال نے فلسفہ تمدن کے کئی پہلوں پر اپنے کلام میں روشنی ڈالی ہے۔ یوسف حسین خان اپنی قلم کی روشنائی سے اس روشنی کو روشن تک اور اس نور کو نور علی نور بنادیا ہے۔ انہوں نے نظام معیشت اور نظام معاشرت پر گفتگو کی ہے۔ سماج میں عورت کی حیثیت زیر بحث آئی ہے۔ اقبال کا فلسفہ تمدن کتاب کا مطول اور مفصل باب ہے اور بے حد اہم ہے۔

کتاب کا آخری باب اقبال کے فلسفہ مذہب سے متعلق ہے۔ یہ باب گذشتہ دونوں ابواب سے زیادہ پیچ دار، مغلق، مشکل اور معقد ہے۔ فلسفہ کے مطالعہ اور فلسفیانہ تحریروں کے ذوق اور مناسبت کے بغیر روح اقبال کو سمجھنا مشکل اور اس کے آخری باب کو سمجھنا مشکل رہے۔ فلسفہ اور تصوف کی عمیق اور دقیق بحثیں یہاں موجود ہیں۔ یوسف حسین خان نے اس کی طرف اشارہ کیا

ہے کہ اقبال نہ تو وحت الوجود کے قائل ہیں اور نہ وحدۃ الشہود کے بلکہ وہ وحدۃ الوجوب کے قائل ہیں ۔توحید سے متعلق اس کتاب کے آخری باب میں جو فلسفیانہ نگارشات ہیں وہ بھی بہت آسانی کے ساتھ قابل فہم نہیں ۔خلاصہ یہ ہے کہ روح اقبال بہت بھاری بھرک کتاب ہے اور فکر اقبال کی ایسی شرح ہے جو خود ایک شرح کی متقاضی ہے تاکہ کتاب ہر شخص کے لئے قابل فہم اور لائق ہضم بن سکے ۔ میں اس مقالہ کو فکر اقبال کے مصنف ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم کے اس اقتباس پر ختم کرتا ہوں ۔

اقبال پر درجنوں کتابیں اور ہزاروں مضامین لکھے گئے ہیں اور بے شمار تقریریں اس پر ہو چکی ہیں لیکن یہ سلسلہ نہ ختم ہوا ہے نہ ہوگا ۔اقبال پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں محققانہ تصانیف بہت کم ہیں ۔میرے نزدیک اقبال پر دو کتابیں نہایت عالمانہ نہایت بلیغ اور نہایت جامع ہیں ۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان کی روح اقبال اور مولانا عبد السلام ندوی کی اقبال کامل ، ان دونوں کتابوں کو ملا کر پڑھیں تو اقبال کے کلام اور ان کی تعلیم کا کوئی پہلو ایسا دکھائی نہیں دیتا جو محتاج تشریح اور تشنہ تنقید باقی رہ گیا ہو۔'' (فکر اقبال صفحہ ۱۱۴ ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ ۔)

☆☆☆

ڈاکٹر معین الدین عقیل

فکر اسلامی کی تشکیل جدید

دور حاضر کے عصری تقاضے اور علمائے ہندوستان کا نقطۂ نظر

اسلام کیلئے تاریخ کے دو واقعات نہایت انقلاب آفریں رہے ہیں۔ جنہوں نے اسلام کو فکری اور تمدنی اعتبار سے متزلزل کر دیا اور اسلامی دنیا علم و دانش کی تباہی اور راسخ العقیدگی و روایات سے دوری کا نشانہ بنی۔ دنیائے اسلام کا ایسا اولین واقعہ منگولوں کی تاخت و تاراج تھا جس کے نتیجہ میں عالم اسلام سیاسی و معاشی مضمرات کے ساتھ ساتھ علم و تہذیب کی بربادی سے دو چار ہوا اور سیاسی سطح پر منتشر اور منقسم ہونے پر مجبور ہو گیا۔ ایک عرصہ تک اس کے کئی علاقے ایک دوسرے سے منقطع رہے۔ لیکن اس عرصے میں چونکہ عالم اسلام کی تمدنی و علمی زبان ایک تھی اور مسلمان بصورت عقیدہ مسلمانوں کی تمام معاشرتی اور علمی زندگی کا محور تھا، اس لئے مسلمان اتحاد اسلامی کے احساس سے بے نیاز نہ ہوئے اور عقیدے اور زبان نے انہیں باہم ایک دوسرے سے یکسر منقطع ہونے نہ دیا۔ اس زمانے میں عالم اسلام ایسی عالم و فاضل شخصیات سے بھی مستفیض تھا، جو شریعت اور طریقت کے حسین امتزاج کے ساتھ مروجہ روایتی اور عقلی علوم پر اپنی دسترس سے روح اسلام کو علوم و تہذیب میں جاری و ساری رکھنے میں کوشاں اور کامیاب رہے۔

اسلام کیلئے دوسری بڑی آزمائش اس کا یورپ سے متصادم ہونا تھا۔ یورپ اپنے نشاۃ الثانیہ کے بعد صنعتی انقلاب اور سرمایہ داری نظام سے حاصل ہونے والی قوت کے ساتھ فوجی، سیاسی، معاشی اور تمدنی سطح پر اسلام سے متصادم ہوا تو اسلامی علوم و تمدن کے وہ مراکز اور مسلم مملکتیں جو یورپ سے متصل تھیں، اس تصادم کے اثرات سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکیں اور بہت جلد اس تصادم کے اثرات قریب قریب سارے ہی عالم اسلام میں تمدنی و فکری بحران کا سبب بن گئے۔ اس صورت حال میں کہ اسلامی دنیا اور عیسائی دنیا میں باہمی آویزش یوں بھی صدیوں سے موجود تھی۔ اس لئے آویزش کا یہ تازہ عمل کوئی ڈیڑھ سو سال تک جاری رہا۔ اور اب تک جاری ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کے عالم اسلام کا مذہبی اور تہذیبی اتحاد مغرب کے زیر اثر شدید طور پر متزلزل ہو کر

رہ گیا۔ ان حالات میں خاص طور پر انیسویں صدی میں، مثلاً ہندوستان میں عیسائی تبلیغی کوششوں کے ذیل میں مستشرقین نے جن میں ولیم میور William muir اور الوئس اشپرنگر Alois) (Sprenger نمایاں ہیں، اسلام کی بنیادوں کے بارے میں ایسے سوالات اٹھائے جو مسلمان علماء کیلئے دعوت مقابلہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور وہ ان سوالات کے نتیجے میں، اسلام کی نئی تعبیر وتشریح پر مجبور ہو گئے۔

مغربی تہذیب اور جدید تمدن نے عالم اسلام میں سیاسی اور تہذیبی انتشار اور پراگندگی پیدا کر دی اور اسلام کی گرفت، کو کمزور کر دیا۔ اس عمل میں جدید اور بے مقصد تعلیم کے فروغ نے بھی عالم اسلام میں شدید افراتفری پیدا کر دی۔ قبل ازیں مسلمان روایتی تعلیم کے وسیلے سے اپنے علوم اور تمدنی ورثے سے قریب تھے۔ ان کی روایتی تعلیم میں دینی علوم کے ساتھ ساتھ عقلی علوم، سائنس اور ریاضی بھی شامل تھے اور زبان وادب بھی۔ جدید تعلیم کے فروغ نے انہیں اپنے علمی اور تہذیبی ورثے سے لاتعلق اور مذہب کے بنیادی عناصر سے دور کر دیا۔ اب جدید تعلیم کے حامل مسلمانوں کی بڑی تعداد اسلام کو اس کی تمام صفات کے ساتھ دیکھنے سے قاصر ہے۔ اب عالم اسلام میں وقت کے نئے تقاضوں اور زندگی کے نئے چیلنجوں کا عالموں اور دانشوروں کا صرف وہی طبقہ سامنا کر سکتا ہے جو اسلام کے پورے علمی وتمدنی سرمایہ سے واقف ہو۔ اور وہ عالم اسلام کو ایک مکمل ضابطہ حیات سمجھتا ہو۔ ایسے علماء اور مفکرین سمجھتے ہیں کہ اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے اور عصری تقاضوں کی مناسبت سے احکام اسلام کی نئی تعبیر، وضاحت یا فکر اسلامی کی تشکیل جدید میں اسلام کا کوئی اصول مانع نہیں۔ بشرطیکہ ایسی وضاحت نو یا تشکیل نو احکام اسلامی (قرآن وحدیث) کی اصل روح کے مطابق ہو۔ اس عمل میں روایت سے انحراف نہیں، اس کی توسیع مقصود ہونی چاہئے۔ اس نقطۂ نظر کے حامل علماء میں، جنوبی ایشیاء میں جہاں اقبال پیدا ہوئے، زندگی بسر کی اور فکر اسلامی کی تشکیل جدید پر زور دیا۔ خود اقبال سب سے نمایاں ہیں۔ جنوبی ایشیاء میں جو مذہبی فکر کارفرما رہی ہے، اس کا کوئی تاریخی یا کوئی جامع جائزہ لینا یہاں مقصود نہیں، بلکہ صرف ان چند مثالوں کا حوالہ مقصود ہے جن سے خاص خاص مماثل یا متخالف تصورات نمایاں ہوتے ہیں۔

اقبال سے قبل، عہد جدید کے جنوبی ایشیاء میں، فکر اسلامی معقولات تک مخصوص رہ کر اپنا وہ سفر

مکمل کر چکی تھی جس کو اکبر کے زمانہ میں حکیم فتح اللہ شیرازی (متوفی ۱۵۸۵ء) نے فروغ دیا تھا۔ معقولات کی یہ روایت فتح اللہ شیرازی سے شروع ہو کر ان کے شاگرد عبدالسلام لاہوری (متوفی ۱۶۲۷ء) اور ان کے شاگرد ملا عبدالسلام اودھی (متوفی .....) تک پہنچی تھی۔ ان سے ملا قطب الدین سہالوی (متوفی ۱۶۹۱ء) ان سے ملا قطب الدین شمس آبادی (متوفی ۱۷۰۹ء) ملا ارمان اللہ بنارسی (متوفی ۱۷۲۰ء) اور قاضی محب اللہ بہاری (متوفی ۱۷۸۴ء) نے فیض حاصل کیا تھا۔ جب کہ ملا امان اللہ بنارسی سے ملا قطب الدین سہالوی کے فرزند ملا نظام الدین (متوفی ۱۷۴۸ء) نے تعلیم حاصل کی تھی۔ ملا نظام الدین کے علمی وارث ملا عبدالعلی بحرالعلوم (متوفی ۱۸۱۹ء) ہوئے۔ بحرالعلوم سے خیرآباد کا علمی خاندان فیض پایا۔ معقولات کے فروغ کی ایک متوازی راہ شاہجہاں اور اورنگ زیب کے زمانے میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی (متوفی ۱۶۵۶ء) اور میرزاہد ہروی (متوفی ۱۶۹۰ء) نے ہموار کی۔ جن کے شاگرد مولانا عبدالرحیم دہلوی (متوفی ۱۷۱۸ء) سے ان کے فرزند شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳ء۔۱۷۶۲ء) علمائے فرنگی محل اور علمائے خیرآباد فیض یاب ہوئے۔ شاہ ولی اللہ سے شاہ عبدالعزیز دہلوی (متوفی ۱۸۲۴ء) اور پھر ان سے سارے ہندوستان میں فیض عام ہوا۔ علمائے فرنگی محل نے درس نظامی کو مرتب کیا تو اس میں تفسیر و حدیث سے زیادہ منطق، حکمت اور صرف و نحو کو زیادہ فوقیت حاصل رہی۔

ہندوستان کی اس علمی فضاء میں، معقولات نے تو فروغ حاصل کر لیا لیکن اس سے منسلک و مستفیض علماء میں سے کسی نے عصری تقاضوں کے تعلق سے فکر اسلامی کی تشکیل جدید پر غور نہ کیا۔ بعض وقتی اور عصری مسائل میں اجتہاد تو ضروری سمجھا گیا۔ اور دور آخر میں اس سے کام بھی لیا گیا لیکن کسی نے احکام اسلام کی نئی تعبیر و تشریح کی ضرورت محسوس نہ کی۔ ان میں شاہ ولی اللہ ضرور مستثنیٰ تھے۔ جنہوں نے اسلامی اساسیات یا اصول پسندی پر اصرار کیا تھا، اور وقت کے نزاعی معاملات میں سنی فقہ کے چاروں مکاتیب میں سے کسی بھی مکتب کے فتویٰ پر عمل کو جائز قرار دے دیا تھا۔ انہیں عصری مسائل کا مکمل شعور حاصل ہو گیا تھا، چنانچہ وہ کہتے تھے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ اسلامی تعلیمات کو پوری طرح منطقی بحثوں اور دلائل سے مسلح کر کے میدان میں لایا جائے۔ انہوں نے فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی کوئی کوشش تو نہ کی لیکن اسلامی تعلیمات کو معاشرے کے بنیادی مسائل اور حالات سے ہم آہنگ ثابت کرنے کی کوشش ضرور کی اور اسلام کے پورے فکری،

اخلاقی ،شرعی اور تمدنی نظام کو مرتب صورت میں پیش کرنا چاہا۔ ان کا یہ انداز تفکر ہر قسم کے مغربی اثرات سے مبرا تھا اور ان داخلی روحانی اور تاریخی قوتوں کا نتیجہ تھا جنہوں نے ان کے عہد میں مذہبی روایات کا بحیثیت مجموعی جائزہ لینے کی ضرورت پیدا کردی تھی۔

سید احمد خان نے بھی ، شاہ ولی اللہ کے بعد، فکری سطح پر یہی کام کیا لیکن ان کے وقت تک مغرب کے اثرات ایک ناگزیر حقیقت بن کر ان کے مقابل کھڑے تھے اور ان اثرات کے نتیجے میں مسلم ملت اور مسلم معاشرہ ان کی طرح کے ایک شخص کو دعوت غور وفکر دے رہا تھا کہ وہ اس وقت کے داخلی حالات اور بیرونی اثرات میں مسلم ملت کو درپیش مسائل کا حل اپنے طور پر سوچے اور ان کے علاج کیلئے اسلام کے اصولوں کی مناسب حال تعبیر کرے۔ سید احمد خان نے کوئی مربوط فکر تو وضع نہ کی۔ لیکن روایتی اسالیب مباحثہ کی از سر نو صحیح اور واضح سمت متعین کرنے کی ضرورت کو تسلیم کیا اور عملی صورت میں غیر واجب مذہبی عقیدہ کی نزاکتوں کو عقلیت پر پرکھ کر دیکھنے اور دوسرے اسلامی اصولوں کو مطلق آزاد کردینے کی کوشش کی۔ ان کی مذہبی فکر میں فقہی مسائل کو قرآن حکیم کی جدلیاتی توضیحات اور تشریحات کے ذریعہ حل کرنے کی جستجو نظر آتی ہے اور اس کے لئے وہ اجتہاد پر غیر معمولی زور دیتے ہیں اور اسے ہر مسلمان کا حق تسلیم کرتے ہیں۔ چاہے وہ فرد دیگر سابقہ علماء کے متعین کردہ معیار کے مطابق اس کا اہل نہ ہو۔ اجماع کے حق کو بھی وہ صرف علماء تک مخصوص نہیں سمجھتے۔ اس قسم کے خیالات پیش کر کے سید احمد خان نے دراصل فکر اسلامی کو حالات ومسائل کے تناظر میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن انہوں نے نہ اس کا اعلان کیا۔ نہ اس پر زور دیا۔

شاہ ولی اللہ اور سید احمد خان کے مقابلے میں سید احمد خان کے رفیق خاص مولوی چراغ علی (۱۸۴۴ء۔۱۸۹۵ء) ایک جانب جہاں قرآن کی نئی تعبیر یا تفسیر پر زور دیتے ہیں، وہیں دوسری جانب خاص طور پر اسلامی قوانین کی کسی نئی بنیاد کے امکانات پر بھی غور کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس بنیاد کا رویہ انسان دوستی پر استوار ہونا چاہئے۔ کیوں کہ انسان معصوم پیدا ہوتا ہے لیکن معاشرہ اسے خطاء وگناہ میں ملوث کردیتا ہے۔ اسلام ایک ترقی پسند مذہب ہے اور اس میں اتنی لچک ہے کہ وہ اپنے سیاسی اور معاشرتی انقلابات کی مناسبت سے خود کو ڈھالنے کی سکت رکھتا ہے ۴۔ وہ سمجھتے تھے کہ اسلامی معاشرتی ودیوانی قوانین کے کچھ اجزاء کو از سر نو لکھنے کی ضرورت ہے۔

اسلامی فقہ کی تدوین نویں اور دسویں صدی کے حالات کے مطابق تھی یہ منجمد معاشروں کی ضرورت تو پوری کرسکتی ہے۔لیکن جو معاشرے مغربی اثرات کے زیر تسلط آچکے ہیں۔مثلاً ہندوستان، ترکی ،مصر، الجزائر ان ممالک میں ایک نئے شرعی نظریے کے وجود میں لانے کی ضرورت ہے۔ جو روایتی نظام میں مکمل تبدیلیاں لا سکے اور وقت کے تقاضوں کے خلاف اصولوں کو خارج کر سکے۔اس اعتبار سے وہ غیر مسلم معاشروں میں مسلمانوں کو ان معاشروں کے قانون سے مطابقت پیدا کرنے کی اجازت دیئے جانے کے حق میں ہیں ۵۔اپنے ان اجتہادی خیالات کے باوصف مولوی چراغ علی فکر اسلامی کو حالات کے تناظر میں ڈھالنے کی ضرورت کے پوری طرح قائل رہے۔

اقبال سے قبل ان علماء کے علاوہ کسی اور نے اپنے حالات کے مطابق مذہبی فکر کو ڈھالنے یا کسی نئے فکری نظام کو مرتب کرنے کی ضرورت کو نہ بیان کیا نہ محسوس کیا۔اقبال کے معاصرین یا مابعد کے کچھ علماء نے اسلام کے فہم واظہار میں اپنی اپنی ذہنی رسائی اور انداز نظر کا ثبوت تو دیا ہے۔مثلا سید ابو الاعلیٰ مودودی اور غلام احمد پرویز ،لیکن ان علماء نے اسلامی فکر کی کسی نئی تشکیل کی اگر ضرورت محسوس بھی کی تو اپنی جانب سے کوئی کوشش نہیں کی اور نہ ہی برملا اس کی ضرورت کے اپنے احساس کو بیان کیا۔ ہاں ان علماء کے معاصرین میں بھارت کے مسلم دانشور آصف بن علی اصغر فیضی (۱۸۹۹ء۱۹۸۱ء) ایک مستثنی مثال ہیں۔ جو ایک جانب مغربی دنیا میں بھی مصروف ہیں اور مسلم دنیا میں بھی ایک شناخت رکھتے ہیں اور ۱۹۴۷ء کے بعد بھارت میں ابھرنے والے واحد جدیدیت پسند مفکر ہیں۔ایک غیر مسلم معاشرے میں رہتے ہوئے انہوں نے عہد جدید میں اسلامی قوانین کو وسیع تر اصولوں میں ڈھالنے کی ضرورت پر شدت سے زور دیا ہے۔ بلکہ اقبال کے علاوہ فیضی ،اقبال کے قریب تر عہد میں واحد مسلمان دانشور ہیں جنہوں نے کھلے لفظوں میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اپنے مطمح نظر کو وضاحت اور تفصیل سے پیش بھی کیا۔ان کے ایسے خیالات مرتب صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔۶۔

فیضی کا خیال ہے کہ عالم اسلام معاشی ، سیاسی اور معاشرتی کمزوریوں کا شکار ہے اور یہ خرابیاں زیادہ تر اندرونی ہیں۔ جب تک بنیادی خرابیوں کا علاج نہ ہوگا اس وقت تک پائیدار صحت کا حاصل ہونا ممکن نہیں۔چنانچہ وہ سمجھتے ہیں کہ زمانہ حال کے مطابق شریعت کی از سر نو تشریح

ضروری ہے اور اس مقصد کیلئے انہوں نے جو تجاویز پیش کی ہیں ان میں سب سے نمایاں مذہب کی قانون سے علیحدگی کا اصول ہے۔ وہ اس علیحدگی کا ایک تجربہ مسلم معاشرے کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کو پختہ یقین ہے کہ اگر شریعت کے پورے نظام کو تنقیدی نظر سے جانچا جائے تو مذہب کے روایتی اور مستحکم خاکے کے ساتھ نئی شکلیں پیدا ہوں گی، جو شاید عالم اسلام میں شامل ایک ملک میں دوسرے ملک سے مختلف ہوں اور شاید ان شکلوں میں نقائص اور کمزوریاں بھی ہوں لیکن رفتہ رفتہ ضوابط کی ایک مستقل اور صاف شکل نمودار ہوگی جو دراصل اسلام کی از سر نو تشریح کی بنیاد ہوگی۔ وہ سمجھتے ہی کہ اس طرح کی نئی تشریح ان کثیر التعداد افراد کے اطمینان کا سبب ہوگی جن کا اعتقاد اب اسلام کے روایتی نظام پر نہیں رہا۔ لیکن اسلام کی اصل روح پر ان کا عقیدہ مستحکم اور راسخ ہو جائے گا۔ ۷۔

فیضی کا اصرار تھا کہ اسلام آج کی دنیا میں متحرک نہ رہا اور عبادات محض بے روح رسومات کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔ وہ اپنے ایسے خیالات میں اس حد تک پر جوش تھے کہ انہوں نے خود کو روایتی عقائد کے مقابل ایک ڈھال کے طور پر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ پختہ یقین رکھتے تھے کہ اسلام میں عقیدہ اور قانون دو الگ الگ عناصر ہیں۔ قانون ایک معاشرتی ارتقائی عمل سے مربوط رہتا ہے اس لئے اسے حالات کے مطابق تبدیل ہوتے رہنا چاہئے۔ اور اس تبدیلی میں معاشرے کے تمام طبقات کا، بلا تفریق مذہب، لحاظ رکھا جانا چاہئے۔ ان کے خیال میں اس طرح کی تبدیلی اسلام کے بنیادی عقیدے کو قطعی مجروح نہ کرے گی۔ ۸۔

عصری مسائل اور حالات کے تناظر میں جس حد تک فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی بابت فیضی نے سوچا، ان کے ساتھ جنوبی ایشیا میں اقبال کے علاوہ کسی اور عالم و مفکر کا نام نظر نہیں آتا۔ کسی حد تک مولوی چراغ علی اس راستے پر چلتے نظر آتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے موضوعات اور اثرات کے لحاظ سے محدود رہے۔

اقبال جنوبی ایشیا کی اسلامی و سیاسی فکر پر اسی طرح چھائے رہے جس طرح انیسویں صدی میں سید احمد خان، لیکن سید احمد خان کی راہ میں مشکلات زیادہ تھیں۔ صرف مذہب کی تعبیر و تشریح ان کا مقصود نہ تھی۔ یہ ان کیلئے محض ان کی وسیع تر تحریک کا جزوی وسیلہ رہی۔ جب کہ اقبال اپنی فکر کو زیادہ مربوط اور منظم صورت میں پیش کرنے میں کامیاب ہو سکے۔

اقبال کی بیشتر فلسفیانہ فکر ان کے اردو کلام اور فارسی مثنویوں میں موجود ہے لیکن ان کے خطبات Reconstruction of Religious Thoughts in Islam میں زیادہ منظم اور مرتب صورت میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کی فکر میں بعض اقدار مثلاً حرکت توانائی اور ارتقاء کی اخلاقی تشریح اور آزادی نمایاں نظر آتی ہیں۔ اردو کلام میں ''خضر راہ'' ان کی وہ اہم نظم ہے جو ان کی شاعری میں انقلابی رجحان کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس میں حرکت اور معاشرتی ارتقاء کی قدر و نوعیت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ جب کہ فارسی مثنوی، ''اسرار خودی'' میں ان کی فکر تنقیدی انداز لئے ہوئے ہے۔ اس میں وہ یونانی فکر کے جامد نظام اور افلاطونی فکر کو رد کرتے ہیں اور اسلام نے یونانی فکر کی حیات تازہ میں جو کردار ادا کیا ہے۔ اقبال اسے تحرک آفریں سمجھتے ہیں۔ یہی رویہ ان کا زوال اسلام کے دور میں اس میں رونما ہونے والی کمزوریوں کے بارے میں ہے۔ وہ اس صورت حال کے تدارک کیلئے قرآنی تعلیمات کو بنیادی طور پر دنیا کے متحرک نظام فکر کی جانب مبذول کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور اسی اصول کے تحت وہ اجتہاد کو قانون کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔ یہاں وہ اسلامی فقہ کو نا قابل تغیر قانون نہیں سمجھتے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ اجتہاد کے ذریعہ معاشرے کی عصری ضروریات کے مطابق اسے تبدیل کیا جاسکتا ہے کیوں کہ یہ اسلامی عقیدے کا لازمی عنصر نہیں۔ عہد زوال میں اسلامی شریعت کا منجمد ہو جانا ایک عارضی حالت ہے جسے ایک تو عصری تقاضوں کے مطابق قرآن کے حوالے سے اور دوسرے حدیث سے احتیاط سے رجوع کر کے اور تیسرے اجماع کے ذریعہ دور کیا جاسکتا ہے۔

اقبال اجماع کو انتہائی اہم قانونی فکر قرار دے کر ضرورتاً اس کے اختیار کرنے پر اصرار کرتے ہیں اور وہ مزید آگے بڑھ کر ایک اسلامی ریاست میں پارلیمانی نظام حکومت کے متفقہ فیصلے کو اجماع ہی کے ذیل میں شمار کرتے ہیں۔۱۰۔

اس لحاظ سے اجتہاد کے عمل کو شریعت کے قدیم انفرادی اداروں یا نمائندہ افراد سے لے کر ایک مسلم مقننہ کو تفویض کرنے کا خیال اقبال کا ایک بڑا انقلابی نظریہ تھا۔ چنانچہ اسلامی ریاستوں میں جمہوریت کی نشو و نما کو وہ ایک خوش آئند علامت سمجھ رہے تھے۔ ان کے نقطۂ نظر سے یہی ایک اقدام ہوسکتا ہے جس سے روایتی اور قدیم اسلام کے دائرے سے باہر آکر ہم نئے راستے پیدا کر سکتے ہیں۔

جنوبی ایشیا کے مغربی تعلیم یافتہ مسلم طبقے نے اقبال کے اس نقطۂ نظر کو توجہ اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور یہ نظریہ رائے عامہ کے اداروں اور مقننہ کی مساوی حیثیت کا حامل سمجھا گیا۔ دیگر مسلم ممالک خاص طور پر ترکی اور مصر اور پھر ایران میں اس نظریہ کے مماثل نظریات دیکھے جا سکتے ہیں۔ اقبال کی فکر اپنے اثرات کے لحاظ سے عالم اسلام کے دیگر مفکرین کو بھی اپنی طرف متوجہ کرتی نظر آتی ہے۔ اقبال کے عہد کے بعد عالم اسلام کو اگر فکری سرگرمیوں کے لحاظ سے مصر، ترکی، ایران اور الجزائر تک مخصوص کر کے جائزہ لیا جائے تو مصر میں سید قطب (۱۹۰۶ء۔۱۹۶۶ء) ترکی میں سعید نورسی (۱۸۶۷ء۔۱۹۶۰ء) ایران میں علی شریعتی (۱۹۳۳ء۔۱۹۷۷ء) اور الجزائر کے محمد ارکان (۱۹۴۱ء.....) تک فکر اقبال کو وسعت پاتا ہوا دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن عالم اسلام سے قطع نظر فکر اسلامی کی تشکیل جدید اقبال کے بعد اگرچہ مزید برگ و بار نہ لا سکی۔ مذہبی مفکرین دانشور اور علماء اسلام کی تعبیر و تشریح اور اسے اپنے زاویۂ نظر سے معاشرے میں عملی صورت اختیار کرتا ہوا دیکھنے کے لئے آرزومند اور متحرک و مستعد تو رہے مگر اسلام کی اصل روح کو متاثر کئے بغیر تشکیل جدید کی کوئی فکرمندی، منصوبہ بندی اور لائحہ عمل ان کا مدعا نہ رہا۔ ہاں ایک شعور اور منصوبہ بندی کا ایک خیال ڈاکٹر سید عبداللطیف (۱۸۹۱ء۔۱۹۷۲ء) کے افکار و نظریات میں نظر آتا ہے جو ایک دانشور مصنف اور متحرک عالم کی حیثیت میں اقبال کے بعد کے قریبی عہد میں علمی، سیاسی اور معاشرتی زندگی میں بہت فعال اور مستعد رہے ۱۱۔ فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے تعلق سے ان کا نقطۂ نظر اور مطمح نظر احادیث کی ترتیب نو پر مبنی تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اسلام کی تعبیر و تشریح میں سب سے بڑا مسئلہ احادیث کے باہمی تضادات کے سبب پیدا ہوتا رہا اور اس وجہ سے مسلمانوں میں فرقوں نے جنم لیا اور ان میں باہمی اختلافات ابھر کر سامنے آتے رہے۔ جنہوں نے مسلم ملت کو کمزور اور بے عمل بنا کر رکھ دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ احادیث جو آغاز میں لاکھوں کی تعداد میں جمع ہوئی تھیں صحت اور استناد کے معیار سے جانچی گئیں تو محض ڈھائی سے تین ہزار تک باقی رہ گئیں۔ ۱۲۔ جب کہ اب بھی متعدد احادیث قرآن کے اساسی نظریات سے متصادم ہیں۔ لہٰذا جب تک اس ذخیرۂ احادیث کو کڑے معیار اور قرآنی کسوٹی پر پرکھ کر انہیں از سر نو ترتیب نہ دیا جائے۔ اس وقت تک اسلامی فکر کی تشکیل جدید یا عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق اسلام کی تعبیر و تشریح اور اس پر عمل ممکن نہ ہوگا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اجتہاد کے نام پر ہونے والی تمام کوششیں تا حال بے سود

ثابت ہوئیں۔۱۳۔لہٰذا اس سارے مسئلے کا حل ان کے خیال میں یہ ہے کہ جدید علمی اصولوں کے مطابق روایتوں کی از سر نو چھان بین کر کے ایک مستند مجموعہ احادیث ایسا ترتیب دیا جائے جو قرآنی تعلیمات کے فہم وادراک میں معاون ہو سکے اور اس میں کوئی حدیث قرآنی نظریات سے متصادم نہ ہو۔اسی طرح عصر حاضر میں اسلام کے مذہبی افکار کی تشکیل جدید اور اسی اساس پر ایک واحب بنیادی فقہ کی تدوین بھی ممکن ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر لطیف اسلامی فکر کی تشکیل جدید کے لئے ایک واحد بنیادی فقہ کی تدوین کو ضروری سمجھتے ہیں۔تا کہ فرقہ بندیاں اور اختلافات ختم ہو جائیں اور یہ کام اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک احادیث کا بھی ایک واحد مستند اور مجموعہ مرتب نہ ہو جائے۔

یہاں ضمنی طور پر ہم مولانا ابوالکلام آزاد کے رویئے کو بھی پیش نظر رکھ سکتے ہیں، جنہوں نے اگر چہ اس طرح کے معاملات ومسائل پر مستحکم غور وفکر کی کوئی محسوس وظاہر کوشش تو نہ کی۔لیکن متعدد شہادتیں اس جانب اشارہ کرتی ہیں کہ ان کا زاویۂ نظر شریعت کے کلی نفاذ یا اس نقطۂ نظر کے قریب تر تھا جسے عرف عام میں 'وہابیت' سے موسوم کیا گیا ہے۔ان کے معتمد خاص اور مصاحب ومقرب محمد اجمل خان اہل قرآن کے حلقے میں شامل تھے اور ڈاکٹر عبداللطیف مولانا آزاد سے متاثر اور ہم فکر وہم خیال رہے۔ڈاکٹر عبداللطیف کے متعدد کام مولانا آزاد کے زیر اثر انجام پائے۔ڈاکٹر لطیف کی قائم کردہ ''اکیڈیمی آف اسلامک اسٹیڈیز'' مولانا آزاد کی تحریک وسرپرستی کا نتیجہ بھی کہی جاتی ہے۔

ڈاکٹر لطیف نے اپنے مذکورہ خیالات ایک کتابچے ''افکار اسلامی کی تشکیل جدید'' ۱۴۔اور ایک مکتوب کی صورت میں متعدد اکابر علمائے اسلام کی خدمت میں روانہ کئے جس کے جواب میں ردعمل مختلف رہا ہے لیکن جو جوابات موصول ہوئے ان میں سے اکثر نے ان کے خیالات کی تائید کی۔گویا فکر اسلامی کی تشکیل جدید کیلئے ایک نئی فقہ کی تدوین اور احادیث کے ایک نئے مجموعے کی ترتیب کو، جو مستند ہو اور تضادات واختلافات سے پاک ہو ضروری قرار دیا۔اور یہ بھی نقطۂ نظر سامنے آیا کہ اگر چہ فکر اسلامی کی تشکیل جدید کیلئے یا مسلم معاشرے کو عہد حاضر کے تقاضوں سے نبرد آزما کرنے کیلئے اجتہاد مفید ہو سکتا ہے لیکن یہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ احادیث میں اختلافات وتضادات موجود ہوں اور یہ قرآن کے اساسی نظریات سے متصادم

رہیں ۔ لائحہ عمل یا فیصلہ جو بھی ہو متفقہ اور مسلمہ ہی مفید مؤثر اور کامیاب ہو سکتا ہے اور یہ اس نقطۂ نظر کے تحت اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ہم میں اختلافات موجود ہیں ۔ بہر حال یہ امور اور یہ معاملات و مسائل مجھے بھی مزید دعوتِ فکر دے رہے ہیں اور یقین ہے کہ آپ کے پیش نظر بھی رہتے ہوں گے ۔

☆☆☆

حواشی

۱۔ڈینیل براؤن "Rethinking Traditions(Denic! Brown) In Modern Islamic Thoughts(کیمبرج'۱۹۹۶ء ص۲۱)

۲۔سید سلیمان ندوی نے معقولات میں علماء کے اس سلسلے کو تفصیل سے درج کیا ہے۔''حیات شبلی'' (اعظم گڑھ،۱۹۴۳ء ص۱۶۔۲۳)

۳۔''حجۃ اللہ البالغہ'' (لاہور'۱۹۵۳ء۔ج۱،ص۴)

۴۔ Proposed political Legal and Social Reforms In the Ottomon Empire(۱۸۸۳ء،۲۱۔۲۳)

۵۔ایضاً،ص۲۷۔۲۸

۶۔ A Modern Approach to Islam (لندن،۱۹۶۳ء)اور ہندوستان میں مذہب اسلام پر نظر ثانی کی ضرورت'' (دہلی'۱۹۵۵ء)

۷۔ہندوستان میں مذہب اسلام پر نظر ثانی کی ضرورت'' ص۳۲۔

۸۔ A Modern Approach to Islam۔ص۱۱۲۔

۹۔ Reconstruction of Religious Thoughts in Islam)لاہور،۱۹۸۶ء ص ۱۳۵ (۱۳۸

۱۰۔ایضاً،ص۱۳۸

۱۱۔جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں انگریزی زبان وادب کے استاد تھے۔انگلستان جاکر کیمبرج یونیورسٹی سے

''اردو ادب پر انگریزی ادب کے اثرات'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا۔ جو مطبوعہ ہے ۔انگلستان سے واپسی پر ایک علمی مجلّہ Clarion جاری کیا۔ اسلامی تہذیب، سیاست و معاشرت آپ کے مخصوص موضوعات دلچسپی تھے جن پر متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ قومی اور سیاسی رہنماؤں سے بھی تعلقات تھے جن میں علامہ اقبال، ابوالکلام آزاد، محمد علی جناح، مسٹر گاندھی، جواہر لال نہرو بھی شامل تھے۔ تحریک آزادی کے دوران جو مختلف تصورات سامنے آئے ان میں ڈاکٹر لطیف کا تصور یہ تھا کہ ہندوستان تو ایک وفاقی دستور کے تحت رہے اور پاکستان تہذیبی منطقوں کی بنیاد پر وجود میں آئے۔

علمی اور عملی سطح پر بہت متحرک زندگی گزاری۔ علمی تحقیقات اور مطالعات کے لئے اولاً ''انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز'' قائم کیا۔ ''اکیڈیمی آف اسلامک اسٹڈیز'' قائم کی۔ ان اداروں کے تحت متعدد علمی و تحقیقی کتابیں تصنیف و شائع کیں۔

۱۲۔ ''افکار اسلامی کی تشکیل جدید'' مطبوعہ ''اکیڈیمی آف اسلامک اسٹڈیز'' حیدرآباد، ۱۹۵۲۔ ۱۸

۱۳۔ ایضاً۔ ص ۱۹۔ ۲۰

۱۴۔ محولہ بالا۔

☆☆☆

مصحف اقبال توصیفی

اقبال کی ایک معرکتہ الآراء غزل

فطرت کو خرد کے رُو برو کر
تسخیرِ مقامِ رنگ و بُو کر
تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے
کھوئی ہوئی شئے کی جستجو کر
تاروں کی فضا ہے بیکرانہ
تو بھی یہ مقام آرزو کر
عریاں ہیں ترے چمن کی حوریں
چاکِ گل و لالہ کو رفو کر
بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اُس سے نہ ہو سکا وہ تو کر
(اقبال)

.....

اقبال کی شاعری کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ ہمیں اس میں ایک خاص نظریۂ حیات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اقبال چونکہ مشرقی اور مغربی علوم پر یکساں قدرت رکھتے تھے اس لیے مذہب سے گہرے شغف کے باوجود ان کی شاعری اور شخصیت میں ایک ایسی فلسفیانہ رَو اور وسیع النظری ملتی ہے جو انہیں اپنے دور کے نیم مذہبی سماجی عقائد، رسومات اور توہمات کا از سرِ نو جائزہ لینے پر اکساتی ہے۔ اس لیے وہ اپنے عہد کے ہند اسلامی معاشرے، اس کی تہذیب اور روایات کے اندھے مقلد نہیں تھے۔ بلکہ ایسے لوگوں پر ان کی شاعری میں طنز کی مثالیں جا بہ جا ملتی ہیں۔ چونکہ اقبال زندگی کے بارے میں ایک صالح نظریہ رکھتے تھے اور اپنی قوم کی اخلاقی، علمی، تمدنی اور

سیاسی پس ماندگی انہیں مُتر دِد اور متفکر رکھتی تھی، اس لیے ان کے لیے ناگزیر ہوگیا تھا کہ وہ ساری قوم کی اصلاح اور رہبری کا فریضہ اپنے اوپر عاید کرلیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی بیش تر اردو نظموں میں ہمیں ملت کے جذبات کو بیدار کرنے، خودی کی تعمیر اور عمل کی تلقین کی شعوری کوشش نظر آتی ہے۔ لیکن اقبال کی شاعری کا اصل جوہر اور اسی سکے کا دوسرا رخ یہ ہے کہ وہ اپنے علم و آگہی، فلسفیانہ نگاہ اور حوصلۂ پرواز کے باعث اپنے اس مخصوص نظریۂ حیات کو ایک ایسی ارتفاعی سطح تک لے آتے ہیں جو ہمیں ایک ماورائی حقیقت سے متعارف کرواتی ہے۔ اقبال سے پہلے غالب تنہا شاعر ہیں، جن کے کلام میں اشیاء اور حقیقت کا فلسفیانہ ادراک، ذہن ونگاہ کو ایک ماورائی کیفیت سے ہمکنار کرتا ہے۔ لیکن چونکہ غالب کی شاعری کسی مخصوص نظریہ حیات کی تابع نہیں اس لئے ہم غالب کے ساتھ، فضا میں جست تو لگاتے ہیں لیکن اپنے قلب ونظر میں آکسیجن کی کمی کے باعث اسی فضا میں جلد ہی منتشر بھی ہوجاتے ہیں۔ اقبال کیساتھ ہم ایسے کسی فضائی حادثے سے محفوظ رہتے ہیں کیوں کہ اقبال قرآن اور حدیث کی روشنی میں جو بصیرت حاصل کرتے ہیں وہ اپنی شاعری کے ذریعہ ہم تک اس طرح پہنچاتے ہیں کہ آسمانوں کی سیر کے باوجود، زمین سے ہمارا رشتہ منقطع نہیں ہوتا۔ اقبال کے بعد آنے والے شاعروں میں، ترقی پسند تحریک سے وابستہ شاعروں کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک آئیڈیالوجی رکھتے تھے لیکن چونکہ ان کے مقاصد سماجی، فلاحی ہونے کے علاوہ سیاسی ہونے کے سبب وقتی تھے اس لئے وقت کے ایک معین نقطہ تک پہنچتے پہنچتے ان کی معنویت معدوم ہوگئی اور ان کے بارے میں آفاقیت کا وہ تصور بھی محال ہے جس سے ہم اقبال کی شاعری کو نشان زد کرسکتے ہیں۔

اس پس منظر میں جب ہم اقبال کی اس غزل کو پڑھتے ہیں تو رفتہ رفتہ اس کے اسرار ہم پر کھلنے لگتے ہیں۔ صرف پانچ اشعار پر مشتمل مختصر بحر میں یہ غزل مجھے تو ایک طویل نظم لگتی ہے۔ نظم اس لئے کہ ہر شعر میں قدرت کے جلال و جمال کے پیکر، خیال کی ایک ہی ڈور میں بندھے نظر آتے ہیں۔ طویل اس لئے کہ ہر شعر، ہر مصرعہ معنی کا ایک دفتر کھول رہا ہے۔ مطلع پڑھئے فطرت کو خرد کے روبرو کرنے اور مقام رنگ وبو (کائنات) کی تسخیر سے شاعر کی کیا مراد ہے۔ فطرت کے مظاہر میں ہمارا پہلا سروکار زمین سے ہے جس پر ہم پیدا ہوئے اور زمین کے بعد ہمارا سب سے گہرا رشتہ آسمان سے ہے۔ کلام الٰہی میں ارشاد ہے کہ ''جس نے کیا واسطے تمہارے زمین کو بچھونا اور

آسمان کو چھت اور اتارا آسمان سے پانی..... پس نکالا ساتھ اس کے پھلوں سے رزق تمہارے واسطے پس مت مقرر کرو واسطے اللہ کے شریک اور تم جانتے ہو......'' (البقرہ۔آیت ۲۲) تو کیا یہ مطلع اس آیت مبارکہ کی جانب اشارہ اور اس کی تفسیر کی جانب ایک ادنیٰ سی کوشش اور اسی کے فیض کی بدولت ایک اعلیٰ تخلیقی کاوش نہیں ۔ رات، زمین ....، بچھونا...... ، ایک عارضی موت ..... ۔ تاکہ ہم دن بھر کے بُرے بھلے اعمال سے تھکے ہوئے کچھ دیر سو سکیں ۔ پھر جاگیں تو اس طرح کی فطرت'' خرد کے روبرو ہو'' کیا یہ کنایہ نہیں اس دنیوی زندگی کا۔ صبح ہمارا جاگنا کیا اس جانب اشارہ نہیں کہ جب وہ خالق باری ہمیں اس عارضی موت کے بعد پھر بیدار (پیدا) کرسکتا ہے تو آخرت میں بھی ہمیں'' بیدار'' کرے گا۔ اور یہ آسمان کیا ہے؟'' سما'' یعنی ہم جس چیز کو جہاں جہاں آنکھ اٹھا کر دیکھیں ۔ تو یہ ایک عمارت ہے، ایک چھت جو رات اور دن میں ، نیند میں اور عالم بیداری میں ہماری حفاظت کرتی ہے ۔ آسمان کی کئی پرتیں ہیں ۔ ہمارے سر پر آکسیجن کی ایک چادر تان دی گئی ہے تاکہ ہم سانس لے سکیں ۔ ایسی فضا تشکیل کر دی گئی ہے جو شہاب ثاقب سے ہماری حفاظت کر سکے ۔ یہی آسمان کئی مَن وزنی بادلوں کو تھامتا ہے انہیں روانی دیتا ہے ، پانی برساتا ہے اور پھر پردۂ عدم سے اس پانی کے ذریعہ ہمیں پھل ، غذا میسر آتے ہیں ۔ اقبال کے اس شعر (مطلع) میں'' تسخیر کائنات'' سے مراد وہ عرفان ہے کہ ہم جانیں وہ کون ہے جس نے اس کائنات کو پیدا کیا اور ہمیں اور ہم سے پہلے ہمارے آباو اجداد کو۔ ہم تخلیق اور اس تسلسلِ تخلیق کے نظام کو سمجھیں ('' کہ آرہی ہے و مادم صدائے کن فیکون'') اور پھر سب سے بڑا عمل یہ ہوا کہ اپنے اندر عبدیت کی شان پیدا کریں ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تسخیر کائنات کیسے ہو۔ عبدیت کی شان کیوں کر پیدا ہو؟ اقبال کہتے ہیں یہ عبدیت کی شان تو ہم میں تھی ، ہم نے کھو دی لیکن یہ پھر پیدا ہو سکتی ہے ۔ اگر ہم اپنی خودی کو بروئے کار لائیں ۔ وہ کہتے ہیں'' تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے ۔ کھوئی ہوئی شئے کی جستجو کر'' عالم خوندمیری نے اقبال کی فکر کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اقبال کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وقت پر کیسے فتح حاصل کی جائے۔'' تکوین'' (یعنی ہست Becoming تخلیق اور اس کے ساتھ ہی فنا کا تصور) کے ہنگامے اقبال کو چونکاتے ہیں ۔ لیکن اقبال کے خیال میں دوام کی منزل کی آگہی ہمیں اس مکمل خودی کے تصور سے قریب تر کرتی ہے جو ذات محمدیؐ کی صورت میں جلوہ گر ہے اور اسی رہنمائی کے فیض سے ہم شعورِ نفس اور ماورائے نفس کا

وہ عرفان حاصل کر سکتے ہیں جو تسخیر کائنات میں ہماری مدد کرے گا۔ (انسانی تقدیر اور وقت'' عالم خوندمیری۔ اقبال کشش اور گریز۔ 1985 اقبال اکیڈیمی حیدرآباد) یوں اقبال تسخیر کائنات کے لئے توحید کے بعد اب رسالت کے اثبات کا پیغام دیتے ہیں۔ کیوں کہ صرف ذات محمدی ہی مکمل خودی کا پیکر ہے۔ اب اقبال ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہیں، ان کے نزدیک تسخیر کائنات بھی انسان کی آخری منزل نہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

تاروں کی فضا ہے بیکرانہ
تو بھی یہ مقام آرزو کر

یہ مقام آرزو کیا ہوسکتا ہے، تاروں کی فضا؟ کیا یہ عام ستارے ہیں یا تجلیات ربانی؟ اقبال چاہتے ہیں کہ ہماری خودی ہمیں ایسی بیکراں فضا میں لے جائے جہاں یہ چاند ستارے جو ہم کو دیکھ رہے ہیں ہم اس سے بہت آگے دیکھ سکیں کہ کہکشاں تو بہت چھوٹی ہے۔ سائنس کے مطابق اس کے آگے ہزاروں Galaxies ہیں۔ اسلامی عقیدے کے تحت بھی سات آسمان ہیں اور ہماری طاقتور سے طاقتور دوربین اور خلائی تجربہ گاہیں بھی ہماری آنکھوں کے سامنے سے ہماری کم نگاہی کا پردہ نہیں ہٹا پاتیں۔ اگر ہم اقبال کی فکر کے آئینے میں جھانک سکیں تو ان تاروں کا آسمان، تجلیات الٰہیہ کی جلوہ سامانی کی ایک جھلک اور قرب الٰہی کی تمنا کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔ یہ وہ معراج ہے جو حضورؐ کو حاصل ہوئی۔ اور ہمارے لئے تو رضائے خداوندی اور حب رسولؐ ہی مقام آرزو ہوسکتا ہے۔ اب ہم اس غزل کے تیسرے شعر تک آتے ہیں۔

عریاں ہیں ترے چمن کی حوریں
چاکِ گل ولالہ کو رفو کر

اس شعر کا ایک مفہوم تو یہ ہوگا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم اس مقام آرزو کو پاسکیں جب کہ انسانی آلام ومصائب چارسو ہمیں گھیرے ہوئے ہیں۔ ہمارے معاشرے کا ایک ایسا زخم یا ناسور ہیں جس پر عمل جراحی کے بغیر (چاکِ گل ولالہ کو رفو کر) قدرت نے یہ حسین کائنات جو ہمیں عطا کی ہے۔ ہم اس نعمت سے فیض یاب نہیں ہوسکتے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے اپنے معاشرے کی اصلاح کی جانب قدم اٹھائیں۔ انسانیت کے دکھ درد کا جائزہ لیں کیوں کہ خودی کے ارتقاء کے لئے روح کے علاوہ جسم کی صحت بھی ضروری ہے جسم جو دنیاوی آلائشوں میں اپنا حسن کھو بیٹھا

ہے، پہلے اسے درست کریں کیوں کہ معاشرے کا جسم ایک عام مادی انسانی جسم نہیں۔ یہ ایسا جسم ہے جس میں نیکی، محبت، اخوت، عبادات، عقیدے کی راستگی وہی فعل انجام دیتے ہیں جو کام عام انسانی جسم میں دل، دماغ اور گردے کرتے ہیں۔ معنیٰ کا ایک رخ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سائنسی اور صنعتی ترقی نے جو ماحولیاتی آلودگی پیدا کی ہے اور جن environmental hazards کا آج ہمیں سامنا ہے، اقبال نے انہیں ہم سے پہلے ہی محسوس کرلیا۔ تیسرا رخ یہ کہ کہیں اقبال کا اشارہ مغربی تہذیب کی اس یلغار کی طرف تو نہیں جس میں نسوانی حقوق اور آزادی کے پردے میں، پردے کی مخالفت کی گئی اور اسے ایک مذموم رواج کا درجہ دیا۔ اشارہ، اس دلچسپ معرکہ آرائی کی طرف جو بیسویں صدی کے اوائل میں دو ابھرتی ہوئی شاعرات کے درمیان ہوئی۔ مشہور کارخانۂ عطر، اصغر علی، محمد علی کے مالک حاجی محمد اصطفیٰ خان کی بھتیجی، محمد ارتضیٰ خان کی بیٹی زاہدہ خاتون (بیگم زاہدہ خلیق الزماں) جو پردے کی موافقت میں تھیں اور لکھنو کے مشہور حکیم، حکیم حافظ محمد عبدالولی کی بیٹی عصمت آراء بیگم کے درمیان جو پردے کی مخالف تھیں۔ ان میں سے ایک نے پردے کی موافقت یا مخالفت میں نظم لکھی اور شائع کروائی تو دوسری نے اس کے جواب میں اپنی نظم شائع کروائی {حوالہ۔ غزلیں گرد کے مانند'' (خودنوشت سوانح عمری) خلیق ابراہیم خلیق۔ فضلی سنز، کراچی 1999ء} یہ اقبال کا آخری زمانہ رہا ہوگا اور ممکن ہے اقبال زاہدہ خاتون کے ہمنوا ہوں اور سوچتے ہوں کہ یہ روش ایسی ہے گویا مسلمان عورتیں، اپنی شرم وحیا کا زیور اتار کر پھینک رہی ہوں۔ (''عریاں ہیں ترے چمن کی حوریں'') مختصر ایہ کہ میرے خیال میں اس شعر میں معنیٰ کی کئی سطحیں ہیں اور یہ ہمارے فہم وادراک پر منحصر ہے کہ ہم اس شعر کو کسی معنی کا لباس پہناتے ہیں۔

اس غزل کا آخری شعر۔ ''بے ذوق نہیں اگر چہ فطرت: جو اس سے نہ ہوسکا وہ تو کر'' ہمیں چونکاتا ہے۔ آخر اقبال کہنا کیا چاہتے ہیں؟ کیا ان کے خیال میں اس نظام کائنات میں ابھی gaps ہیں اور انسانی خودی ہی اسے پُر کرسکتی ہے۔ فطرت کا یہ عمل عمداً بھی ہوسکتا ہے یعنی تسلسلِ تخلیق، لیکن کیا اقبال یہ سوچتے ہیں کہ فطرت کا یہ عمل انسانی ارادہ یا خودی کا محتاج ہے؟ مصرعہ کا یہ آخری ٹکڑا ''جو اس سے نہ ہوسکا''۔ ہمیں شش وپنج میں مبتلا کرتا ہے۔ میں بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک بڑے فن کار کی تخلیقی جست ہوسکتی ہے۔ جسے شمس الرحمٰن فاروقی نے تخلیقی بے اطمینانی کا نام

دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ''حقیقت تو یہ ہے کہ بے اطمینانی تمام تخلیقی ادب کا منبع ہے۔ بے اطمینانی نہ ہو تو عبداللطیف کا پیار اور ڈز ورتھ بھی نہ ہو، ٹالسٹائی اور بھرتری ہری بھی نہ ہوں، شیلی اور کیٹس نہ ہوں اور شکسپیر اور میر اور رومی اور کالی داس بھی نہ ہوں۔ ڈکنس اور بالزاک، دوستوسکی نہ ہوں، حد تو یہ ہے کہ اقبال بھی نہ ہوں'' (شمس الرحمٰن فاروقی ''باز دید۔ نقدِ غالب کی بوالعجبیاں''۔ اردو ادب، اکتوبر۔ دسمبر 2006) میری ناقص رائے میں اس غزل کا یہ آخری شعر، ایک بڑا شاعر جو برہمن زادہ'' بھی ہو، وہی کہہ سکتا ہے۔ ایک بڑا دماغ ہی اس طرح سوچ سکتا ہے۔ ایسی جسارت کر سکتا ہے ہم اور آپ نہیں.....!!

آخر میں چند سطور اس غزل کے ادبی محاسن کے بارے میں۔ ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ اقبال نے کس طرح ایک نہایت فلسفیانہ اور سنجیدہ موضوع کو نہایت جامع انداز میں محض چند اشعار میں سمیٹ لیا۔ ''تسخیر مقام رنگ و بو''، ''تاروں کی فضائے بیکرانہ''، ''مقام آرزو''، ''چمن کی حوریں''، ''چاک گل و لالہ'' یہ چند الفاظ یا تراکیب نہیں اوراقِ معانی ہیں جنہیں ہم آنکھ بند کر کے پہروں عالمِ استغراق میں پڑھ سکتے ہیں۔ پھر سہل ممتنع کا یہ انداز کہ ''تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے'' ''کھوئی ہوئی شئے کی جستجو کر۔'' عجیب شعر ہے جو اس قدر سادگی سے اسلامی معاشرے کے تمدن اور عروج کے زمانے سے لے کر آج اس کی زبوں حالی کے دور کی ساری تاریخ دو مصرعوں میں اس طرح دوہراتا ہے کہ دل پر نقش ہو جائے۔ ایسا لگتا ہے کہ اقبال اپنے دیوان خانے میں بیٹھے ہیں۔ یہ شعر سنا رہے ہیں جسے نہ صرف ہم بلکہ در و دیوار بھی کان لگائے سن رہے ہیں۔ میر کے الفاظ میں اس طرح کہ ''منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ'' میر نے سچ کہا تھا ''چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر۔'' اس غزل میں اقبال کی چشم بینا بھی ہمیں ایسے آئینۂ خانہ کی سیر کرواتی ہے جس میں کائنات کے کئی سربستہ راز خود بخود کھلتے چلے گئے ہیں۔

☆☆☆

محمد ظہیر الدین
صدر اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد

مسلم طلباء وطالبات کی شخصیت سازی
(تعلیمات اقبالؔ کی روشنی میں)

جناب رشید انجینئر کا حکم ہے کہ چند سطور دئے گئے عنوان پر تحریر کروں۔ موصوف نے اپنی عمر عزیز کو مسلم نوجوانوں کی تعلیم کے وقف کردیا ہے۔ وہ ایک بے لوث، خاموش، شہرت و نام ونمود سے بے نیاز شخص ہیں ان کی شخصیت اور خدمات قابل رشک ہیں، اس لیے میرے لئے انکار کا مرحلہ سخت دشوار ہے۔ نہ تو میں مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں کوئی عملی تجربہ رکھتا ہوں نہ ماہر تعلیم ہوں۔ کیوں کہ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے میری پہچان، اقبال اکیڈیمی کے حوالے سے ایک ''اقبالی مجرم'' کی بن گئی ہے اس لیے شاید انہوں نے مجھے اس موضوع پر لکھنے کے لیے فرمایا ہے۔

اقبال روایتی معنی میں ماہر تعلیم نہیں تھے۔ ہاں انہوں نے ایک دردمند دل رکھنے والے صاحب نظر کی حیثیت سے مسلم نوجوانوں، خصوصاً طلباء وطالبات کی تعلیم وتربیت پر نظم اور نثر میں بہت کچھ لکھا ہے۔ چنانچہ ''بچوں کی تعلیم وتربیت'' کے موضوع جنوری ۱۹۰۲ء میں ہی ایک مضمون لکھا تھا جو ''مخزن'' میں شائع ہوا تھا، اس مضمون میں بچوں کی ذہنی اور اخلاقی نشوونما کے نفسیاتی پہلوؤں کا اقبال نے جائزہ لیا تھا۔

اس سوال کے پیچھے کہ شخصیت سازی کے لیے اقبالیات سے کس طرح استفادہ کیا جاسکتا ہے؟ یہ تمنا پوشیدہ ہے کہ موجودہ دور کے اخلاقی انحطاط وشخصیت کے انتشار کے تناظر میں عصری درس گاہوں میں تعلیم پانے والے طالب علموں کے کردار کی تشکیل اور شخصیت سازی کے کیا امکانات ہیں اور ان کی عملی صورت گری کے کیا امکانات ہوسکتے ہیں۔ اس سوال کا جواب خود کئی سوالات کو جنم دیتا ہے جو نہ صرف نظریاتی بلکہ عملی سطح پر ارباب علم ودانش کے غور وفکر کے محتاج ہیں۔ یہاں صرف اقبالیات کے حوالے سے شخصیت سازی اور اعلیٰ اخلاقی صفات کی نشوونما کے لیے فکر اقبال سے راہیں متعین کرنا ہے۔ گہرے

علمی مسائل اور فلسفیانہ تجزیوں کے بغیر سیدھے سادے انداز میں اقبال کے خیالات کو پیش کرنا ہے۔

ابتدا میں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ ہمارے عصری درس گاہوں کے نصاب میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم کا پہلو شامل نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مقامی انتظامیہ اس سلسلہ میں ضروری اقدامات کے لیے آزاد ہے۔ ظاہر ہے کہ میں تکثیری سماج میں کسی گروہ کی مذہبی اور تہذیبی شناخت کا مسئلہ اہم ہو جاتا ہے لیکن یہ واضح رہے کہ ایسا کوئی تشخص isolation پورے معاشرے سے کٹ کر نہ تو ممکن ہے نہ مستحسن۔ اگر ملک کے کسی گروہ کے لیے ایسے اقدامات جو نوجوانوں کی شخصیت و کردار کو سنوارنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں تو بلا لحاظ مذہب وملت پورے ملک اور معاشرہ کا بھلا ہوگا۔ اقبال نے اپنے مذکورہ بالا مضمون ''بچوں کی تعلیم وتربیت'' میں اس جانب اشارہ ان الفاظ میں کیا تھا کہ صدہا انسان ایسے ہیں جو دنیا میں زندگی تو بسر کرتے ہیں مگر اپنے اخلاقی تعلقات سے محض جاہل ہوتے ہیں، ان کی زندگی جانوروں کی طرح ہے کیوں کہ ان کا ہر فعل خودغرضی اور بے جا خودداری کے اصولوں پر مبنی ہوتا ہے اور وہ اس مبارک تعلق سے غافل ہوتے ہیں جو بہ حیثیت انسان ہونے کے ان کو باقی افراد بنی نوع (یعنی انسانیت) سے ہو۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلم طلباء اور طالبات کی شخصیت سازی اور کردار کی تشکیل محض ایک ملی مسئلہ نہیں بلکہ پوری انسانیت کی فلاح کا پہلو بھی اس میں شامل ہے۔

اب آگے بڑھنے سے پہلے شاید مناسب ہوگا کہ ہم شخصیت کی کوئی آسان اور قابل فہم تعریف متعین کرلیں۔

ہر انسانی شخصیت ظاہری اور روحانی اعتبار سے منفرد ہوتی ہے یعنی وہ دوسرے سے جدا اور ممتاز ہوتی ہے۔ دوسرے معنی میں شخصیت انفرادیت کا نام ہے۔ شخصیت سازی کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ انسان اپنے وجود کی اہمیت اور مقام کو سمجھے، اپنی ذات اور اس کی عظمت کو پہچانے کہ خالق کائنات نے اسے بہترین صلاحیتوں کے ساتھ پیدا فرمایا ہے۔ اس کے اندر بے پناہ استعداد اور قابلیت رکھ دی گئی ہے۔ اب ان صلاحیتوں کی پہچان اور ان کو ترقی دینا انسان کا اخلاقی اور مذہبی فریضہ ہے۔ اگر وہ اپنی شخصیت کی نشوونما نہیں کرتا تو وہ اپنے وجود کے منشاء کی تکمیل نہیں کرتا۔ دنیا کی ہر چیز اپنا اظہار چاہتی ہے۔ ایک بیج کے اندر ایک تناور درخت کا روپ دھارنے کی صلاحیت پوشیدہ ہوتی ہے۔

ظلمت کدۂ خاک پہ شاکر نہیں رہتا ہے
ہر لحظہ ہے دانے کو جنوں نشوونما کا

اقبال کے تصورِ خودی کا مضمون ٹھیٹ علمی اور فلسفیانہ مباحث میں گئے بغیر ''شخصیت'' ہی ہے انہوں نے فرد کے تشخص اور پختگی کو (صدف) سیپی اور گہر (موتی) کے استعاروں سے سمجھایا ہے۔ یعنی پانی کے ایک قطرہ یعنی آب نیساں کو موتی بننے کے لئے صدف کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسانی شخصیت کے لئے یہ صدف اس کا ماحول یا معاشرہ ہے جس کے بغیر اس کا ارتقاء ناممکن ہے۔ صدف میں گہر کا جوہر نہیں ہوتا لیکن اسکی آغوش قطرۂ نیساں کو گہر بنا دیتی ہے۔

آغوش صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر

یہاں شخصیت کی نشوونما اور اس کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے فکرِ اقبال کا ایک اور اہم پہلو اجاگر ہوتا ہے کہ جس طرح موتی اپنے آب وتاب کے لئے صدف کا محتاج ہے، اسی طرح شخصیت کی تربیت معاشرہ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ جس طرح ایک بیج کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ اسے زمین میں بودیا جائے اور اس کے سامان حیات میں ایک طرح کا توازن ہو۔ اگر اس کو زندگی بخشنے والے عناصر میں کمی یا زیادتی ہو جائے تو بیج کے نمو پانے کے امکانات باقی نہیں رہتے۔ اسی طرح فرد کے کمالات اور اس کی استعداد کی ترقی کے لئے ایک نظمِ اجتماعی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اقبال کی اصطلاح میں یہی بیخودی ہے۔

اقبال کے اس ابتدائی پس منظر کی روشنی میں شخصیت سازی کے اقبال کے تصورات کا ایک خاکہ آسانی سے مرتب کیا جاسکتا ہے یہاں چند اہم باتوں کا اشارہ کافی ہے۔

ا۔ پہلی بنیادی بات شخصیت کے عرفان اور اس کی تشکیل مستحکم ایمان اور یقین لازمی ہے۔ انسانی شخصیت کی انفرادی اور اجتماعی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے اس حقیقت کو پیش رکھنا چاہئے کہ خالق کائنات نے اسے کائنات میں اعلیٰ ترین تعلیم عطا کر کے اسے اپنی صفات کے پرتو سے سرفراز فرمایا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا مختلف مدارج کے لحاظ سے انسان میں ظہور ہوا ہے۔ اب شخصیت سازی کے لئے انسان کا فریضہ ہے کہ ان عطا کی گئی صفات کے رنگ کو اپنی شخصیت اور کردار میں گہرا کرے، جتنا یہ رنگ گہرا ہوگا اتنا ہی اس کی شخصیت مستحکم ہوگی۔ تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں بھی اقبال کا کہنا ہے۔

جو ہر میں لاالہ تو کیا . خوف
تعلیم ہو گر فرنگیانہ

اگر موجودہ ماحول ،اس کے عقیدہ اور تہذیبی قدروں کے موافق نہیں ہے لیکن اگر اس کے دل ودماغ میں ''لاالہ'' راسخ ہوتو نہ صرف مخالف ماحول پر غالب آسکتا ہے،اس کی انتشاری قوتوں سے محفوظ رہ سکتا ہے بلکہ اپنی شخصیت کو مستحکم کرتے ہوئے معاشرہ پر اثر انداز ہوسکتا ہے۔گویا توحید کا اقرار شرف انسانیت کا اقرار ہے۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے فقط اک مسئلہ علم کلام
روشن اس ضو سے اگر ظلمت کردار نہ ہو
خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام

شخصیت کے نکھار شادابی وخلاقی کے لئے ایک اور اہم بنیاد محبت بلکہ شدت محبت ہے۔اس کے لئے محبوب کو دل میں بسانا ضروری ہے۔اس طرح کہ یہ محبت،محبوب کی ہر ادا پر عمل اور اتباع کا محور ومرکز بن جائے۔ یہ محبوب کوئی اور نہیں ہے بلکہ ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات گرامی ہے جو ''مقام منزلِ ہر راہروؤ'' ہے اسی محبت میں شخصیت کے ممکنات کا ظہور پوشیدہ ہے۔تفصیل کا موقع نہیں ہے اگر رحمۃ للعالمین ﷺ کی ذات طیبہ کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا جائے کہ آپؐ نے افراد کی صلاحیتوں کو کس طرح پرکھا،ان کی کس طرح ہمت افزائی فرمائی۔ان کی سیرت وکردار کی تشکیل فرمائی کہ ۲۳ سال کے عرصہ میں ساری دنیا کی کایا پلٹ گئی۔دنیا میں ایک انقلاب مسلسل کی بنیاد رکھ دی گئی تو ہماری بصیرت کے لیے کئی پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ یہاں تربیتِ نبویؐ کے سماجی نفسیاتی عوامل ہمارے سامنے ابھر کر آتے ہیں۔اس معاشرہ میں مختلف کردار نظر آتے جو زندگی کے مختلف شعبوں میں مثالی بن گئے۔ ع ذرۂ ریگ کو دیا تو نے فروغ آفتاب۔

اقبال کہتے ہیں مسلمان کی سرشت ایک موتی کے مانند ہے جس کی آب وتاب ''یم پیغمبرؐ'' کی آغوش میں ہوتی ہے۔ ہمارے قائدین،علمائے کرام،واعظین عظام کے سامنے یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے کہ محبتِ رسولؐ کے کھوکھلے دعوے یا زبانی اظہار کافی نہیں ہے بلکہ اس کا اظہار ہماری عملی زندگی میں اس طرح ہونا چاہئے کہ لوگوں کے دلوں میں محبت کی یہ چنگاری روشن کر کے اعلیٰ کردار واخلاق کے نمونے

پیش کئے جاسکیں ۔وعظ اور تلقین سے زیادہ اعلیٰ سیرت اور شخصیت کے نمونے زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں ۔معاشرہ میں سچ سے زیادہ سچے کا وزن ہوتا ہے۔قرآن کریم میں نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ کو مخالفوں اور انکار کرنے والوں کے سامنے یوں پیش کیا گیا ہے ''میں نے اس سے قبل تمہارے ہی درمیان ایک عمر گزاری ہے۔کیا تم عقل نہیں رکھتے ؟''

یہ تو رہی شخصیت سازی کی حقیقی بنیاد ہے۔جس کے بغیر ایک عصری درس گاہ سے فارغ ہونے والا طالب علم اپنے فن میں ماہر تو بن سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ایک اعلیٰ کردار کا حامل بن سکے۔ یہاں عملی اعتبار سے شخصیت سازی کے لئے چند پہلوؤں کی طرف اشارے کئے ہیں ۔جو نہ صرف مسلم طلباء وطالبات کے لئے بلکہ اوروں کے لئے بھی رہنمائی کرتے ہیں ایک جامع اور قابلِ عمل لائحہ عمل مرتب کیا جاسکتا ہے۔اس سلسلہ میں بھی اقبال کی تعلیمات میں کئی نقوش ملتے ہیں ۔

سیرت سازی کے لیے اقبال نے اطاعت اور ضبط نفس پر زور دیا ہے۔اطاعت جبر کا نام نہیں ہے بلکہ دراصل یہ اختیار کی چیز ہے۔احکام الٰہی دراصل انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں ۔جن کی پابندی سے شخصیت میں نکھا پیدا ہوتا ہے۔ضبط نفس انسان کی شخصیت کو بے لگام ہونے سے روکتا ہے۔شخصیت مخالف ماحول ناساز حالات سے گذر کر فروغ پاتی ہے۔اسلام میں جو عبادات فرض کی گئی ہیں اس کا مقصد انسان کے اندر ضبط نفس کو پیدا کرنا ہے جسے قرآن مجید کی اصطلاح میں تقویٰ کہا گیا ہے۔تقویٰ کی روح فکر وعمل کے ہر شعبہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا استحضار ہے۔خداشناسی کا نام ہے اور یہی تقویٰ کی سیرت میں ایک طرح کا Self restraint پیدا کرتا ہے جو ہر قسم کی برائیوں سے محفوظ رکھتا ہے۔عبادت یا عبدیت کا شعور اگر انسان کی شخصیت کو بڑھاوا نہ دے تو یہ اپنے مقصد کی تکمیل نہیں کرتا۔اقبال کا ایک مشہور شعر ہے۔

نماز دروزہ وقربانی وحج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

شعر کا اہم نکتہ ہے ''تو'' باقی نہیں ہے۔اس ''تو'' سے کیا مراد ہے؟ یہ انسانی شخصیت ہی تو ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا مبارک ارشاد ہے کہ ہر شخص کے ساتھ اس کا شیطان لگا ہوا ہے۔یہ شیطان ان تخریبی قوتوں کا نام ہے جو انسان کو اس کے اعلیٰ مقام ومرتبہ سے نیچے گرا کر پستیوں میں ڈھکیل دیتا ہے۔اس لئے شخصیت سازی کے لئے ان انتشاری قوتوں سے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مختلف شکلوں اور

روپ میں آتی ہیں۔ ہرلمحہ اس سے آمادہ بہ جنگ رہنا ضروری ہے۔

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگر چہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات ومنات
یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

شخصیت کی تعمیر کے لئے ضبط نفس نہ صرف شخصیت کو منتشر کرنے والے یا بکھراؤ کی کیفیت پیدا کرنے والے عوامل سے تحفظ ہے بلکہ یہ ایک ایسا حرکی تصور جو ہمارے وجود کو بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے اقبال نے عبادت کے تمام ارکان کے اسرار کو اس نقطۂ نظر سے دلنشیں انداز میں سمجھایا ہے۔

اقبال نے جہاں شخصیت سازی، تعمیر کردار کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا ہے وہیں انہوں نے ان عوامل کی بھی نشاندہی کی ہے جس سے شخصیت میں انتشار، ضعف اور انحطاط پیدا ہوتا ہے کردار کی پستی کے دو اہم سبب ہیں ایک ہوائے نفس کی پیروی اور دوسرے گدائی۔

انسان جب احکام الٰہی کی پابندی اور رضائے الٰہی کے بجائے اپنی خواہشات اور جذبات کا شکار بن کر نفس کا غلام بن جاتا ہے تو شخصیت میں ہر طرح کی مذموم صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ سماج کے اندر خود پسندی، خود بینی کتنی برائیاں پیدا کرتی ہے۔ شہرت کی تمنا، عزت ومنصب کی طلب، دولت کی خواہش نہ صرف شخصیت کو پست کر دیتی ہیں بلکہ معاشرہ میں اختلافات، اور نفرتوں کو جنم دیتی ہیں۔ ایک گروہ دوسروں کو برداشت کرنے کی صلاحیت سے عاری ہو جاتا ہے۔

اسی طرح اقبال کی نظر میں گدائی ایک ایسی مذموم خاصیت ہے جو ذہن اور روح کی آزادی کو سلب کر دیتی ہے اور اسے ہر طرح کی ذلت پر آمادہ کر دیتی ہے۔ گدائی صرف بھیک مانگنے کا نام نہیں ہے بلکہ فکری اور عملی اعتبار سے وہ عمل ہے جو اس کی خودداری، بے نیازی کو ختم کر دیتا ہے۔

دوسروں کی محنت پر تکیہ کرنا بھی گدائی ہے، رشوت بھی ایک گدائی ہے، دوسروں کے افکار وخیالات کو قبول کر لینا بھی گدائی ہے۔ یہ نہ صرف شخصی عزت وقار کے خلاف ہے بلکہ اجتماعی زندگی کی لعنت ہے۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
جب جھکا تو غیر آگے نہ تن تیرا نہ من

اقبال نے اپنے کلام میں کئی حکایات، تشبیہات کے ذریعہ شخصیت سازی، شخصیت کے فروغ اور ترقی کے کئی پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ خصوصاً اقبال نے نوجوانوں کو جو درس دیا ہے اسے ہم ان کی پسندیدہ علامت شاہین کی صفات سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

بہر حال اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ یہ بے ربط مختصر اشارات رشید انجینئر صاحب کی تحریک پر پیش کئے گئے ہیں۔ ان کا سوال تھا کہ مسلم طلباء وطالبات کی شخصیت سازی کے لئے اقبالیات سے کس طرح استفادہ کیا جا سکتا ہے؟

یہ سوال مسلم نوجوانوں کی تعلیمی اخلاقی کردار کی تعمیر کے لئے ان کی دردمندی اور تڑپ کا آئینہ دار ہے۔ لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی ہے بلکہ شروع ہوتی ہے کہ شخصیت سازی کے لئے اقبال کے خیالات وتصورات کی عملی صورت گری کے لئے، موجود محدود وسائل کے روشنی میں کیا اقدامات کئے جا سکتے ہیں، کیا لائحہ عمل مرتب کیا جا سکتا ہے۔ جو بہت زیادہ آرزومندانہ نہ ہو بلکہ قابل عمل ہو

نہیں ہے بندۂ مومن کے لئے جہاں میں فراغ

☆☆☆

حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تقاضے

زندگی میں سوز وگداز، حرکت وحرارت، آرزو کی خلش اور خوب تر کی پیہم تلاش محبت ہی کے دم سے ہے۔ بلکہ ایمان، وارفتگی اور شیفتگی سے ہی عبارت ہے، ایمان کے دائرہ میں آجانا، محبت کے دائرہ میں آجانا ہے۔ ارشاد ربانی ہے ''جو ایمان لائے وہ اللہ سے نہایت درجہ محبت رکھتے ہیں۔ (والذین آمنوا اشدُّ حبا للہ) خدائے واحد پر ایمان کے ساتھ ہی رحمۃ للعالمین وخاتم النبین پر ایمان اور محبت لازمی ہے کلمہ شہادت کا دوسرا جز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عبدیت اور رسالت کا اقرار ہے۔ اس طرح ایمان کی بنیاد ہی اس ذاتِ گرامی سے عقیدت اور محبت ہے جو نہ صرف منشائے تخلیق ہے بلکہ منتہائے تخلیق بھی ہے یعنی تمام صفات وکمالات کا مظہر اتم ہے۔

اسلام کی ساری تاریخ آپؐ کے نام لیواؤں کی عقیدت ومحبت سے پُر ہے۔ اسی محبت کی لطیف کیفیات وجذبات نے نعت کی روایت ڈالی۔ درود وسلام کے مختلف دلنشین، پرسوز وپُر اثر اظہارات ایک مومن کی اسی وابستگی اور شیفتگی کا اظہار ہیں۔ یہاں جس پہلو پر غور کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اس محبت وعقیدت کا تقاضا کیا ہے۔ حقیقی محبت خود ایک حال ہوتی ہے جو ''قال'' کی محتاج نہیں۔ محبت کسی اظہار کی تابع نہیں ہوتی۔ ہر دیکھنے والا اسے محسوس کر لیتا ہے

لیکن آج اس نازک وحساس موضوع کو ''قال'' بنا دیا گیا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے مضمرات پر غور کئے بغیر ہم سہولت کے ساتھ ''حبِ'' رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ بلکہ اتباع سنت واطاعت کے نام پر ہی ایسی باتیں ہوتی بھی ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیواؤں میں محبت کو نہیں نفرت کو جنم دیتی ہیں۔ نیتوں کی بات، دل کا بھید تو اللہ ہی جانے لیکن اس سے زیادہ محرومی وبدنصیبی کی بات کیا ہوسکتی ہے کہ درود وسلام کی بات برسرِ عام نزاع کی وجہ بن جائے، جزوی وفروعی مسائل میں بحث وجدال اتنا بڑھ جائے کہ اسوۂ حسنہ ہی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔

پیغمبروں کی پاکیزہ زندگیوں کے بارے میں افراط وتفریط کے نتائج دیکھنا ہو تو صرف

یہود و نصاریٰ کی تاریخ کافی ہے۔ ایک گروہ نے ظاہر اور کتاب کے پہلو پر اتنی شدت اختیار کی کہ پیغمبر کی ذات اوجھل ہوگئی۔ اور دوسرے گروہ نے پیغمبر کی ذات کے بارے میں اتنا غلو کیا کہ اصل پیام ہی گم ہوگیا۔ اسی افراط و تفریط کی کچھ کیفیات ہماری امت کے اندر بھی کہیں درود و سلام کے نام پر ہوتی ہیں اور کبھی سنت اور اتباع کے نام پر۔ نہ اتباع بلا محبت پسندیدہ ہے نہ محبت بلا اتباع مستحسن ہے۔ بات دراصل یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہم نے نہ تو رسول اللہ ﷺ کے مقام و منصب کو سمجھا، نہ آپ کی دعوت کے منشاء و مقصد کو جانا اور نہ آپ کی امت کے ایک فرد کی حیثیت سے اپنے آپ کو پہچانا، اس منصب اور اس کی ذمہ داری کا جب احساس ہوتا ہے تو بڑے سے بڑے اہلِ دل بھی کانپ اٹھتے ہیں کہ کیا انہیں واقعی اپنی محبت کے اظہار کا حق ہے۔

ایک بزرگ سے ان کے ایک ارادت مند نے عرض کیا کہ سرکار! مجھے ایسا وظیفہ بتا دیجئے کہ خواب میں حضور اکرمؐ کے دیدار سے مشرف ہوسکوں ان بزرگ نے جواب دیا آپ کا بڑا حوصلہ معلوم ہوتا ہے۔ ہم تو اپنے آپ کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ گنبدِ خضراء کا ہی دیدار ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال جیسے عاشقِ رسولؐ نے کہا ہے کہ: جب میں درود پڑھتا ہوں تو میرا وجود شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہے اور عشق یہ طعنہ دیتا ہے کہ تو، تو محکوم غیر ہے، ذرا اپنے دل پر نظر کر کہ کتنے بت براجمان ہیں، جب تک اس ذاتِ گرامی کے رنگ کا پرتو تیرے اندر پیدا نہ ہو جائے اس وقت تک اس نام مبارک کو اپنی زبان پر لانے کی جرأت نہ کر

چو بہ نام مصطفیٰؐ خوانم درود
از خجالت آب می گردو وجود
عشق می گوید کہ اے محکوم غیر
سینۂ تو از بتاں مانند دیر
تانداری از محمدؐ رنگ و بو
از درودِ خود میالا نام اُو

محبت کے تقاضے کو سمجھنا ہو تو اس ذاتِ گرامی سے ہماری نسبت اور ربط کی معنویت کو سمجھنا ہوگا۔ آپ ایک ایسے وسیع، عالمگیر اور ہمہ جہتی انقلاب کے بانی ہیں جو صرف ماضی سے متعلق نہیں بلکہ جس کا سلسلہ جاری ہے۔ ہم سب کا ایقان ہے کہ آپؐ کا اسوۂ حسنہ ابدی ہدایت کا سرچشمہ ہے

۔ یہ اسی ہدایت کا فیضان ہے کہ بہ حیثیت امت ہمارا مقام، ''شھداء علی الناس''، کا ہے جب کہ آپ ﷺ کی ذات گرامی، ''یکون الرسول علیکم شھیدا'' کے اعلیٰ وابدی مقام پر ہے ۔گویا آپ کی ذات سے نسبت وربط اور شیفتگی اور محبت کا بنیادی تقاضا ہے کہ ہم میں اپنے منصب سے آگاہی اور باخبری کا احساس تازہ ہے۔''اور شھداء علی الناس'' کے زمرہ میں شامل ہو کر ساری انسانیت کی تشکیل پر اثر انداز ہوں۔ اسی پس منظر میں اتباع اور اطاعت کا مفہوم بھی واضح ہوتا ہے، یہ رسول اللہ کی اتباع ہی ہے جو اللہ سے محبت کرنے والے کو اللہ کا محبوب بھی بنا دیتی ہے ۔''ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ'' ایک مومن کے لئے اس سے بڑھ کر عزت وافتخار کی کون سی بات ہوسکتی ہے کہ محبّ، محبوب بھی بن جائے لیکن اس کی شرط اتباع رسولؐ ہی ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ اس اتباع میں جب محبت شامل نہ ہو تو یہ نہ صرف میکانکی بن جاتی ہے بلکہ روح سے عاری ہو جاتی ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ذاتِ رسالت مآبؐ سے محبت، ہمیں آپؐ کے لائے ہوئے پیام کو جاری وساری کرنے کی امانت سے بھی مربوط کر دیتی ہے۔

جہاں تک انفرادی زندگی میں سنت کی پیروی اور اتباع کا سوال ہے ہر چاہنے والا یہ چاہتا ہے کہ اس کے ظاہر پر بھی محبوب کا رنگ چڑھ جائے، اگر ظاہر میں محبت اور عشق کا جذبہ کارفرما ہے تو یہ نہ صرف قابل احترام ہے بلکہ اس پر کلام بھی سوئے ادبی ہے۔ لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ سنت کی اتباع اور سنت کی پیروی کے وسیع مفہوم اور اس کے مضمرات کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے ۔رسولِ اکرمؐ کا ارشاد ہے: جس نے سنت کو زندہ ہی کیا اس نے مجھے زندہ کیا۔ اور جس نے مجھے زندہ کیا، اس نے محبت کی مجھ سے، اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ رہے گا ۔ یہاں پھر میں یہ عرض کروں گا کہ ایک ابدی پیام کو نہ صرف پیش کرنے والی بلکہ اسے عملی زندگی میں برپا کرنے والی برگزیدہ ہستی کی سنت کو زندہ رکھنے کا کیا مفہوم ہے؟ جب تک کہ سنت نہ صرف ہماری روحانی زندگی بلکہ تاریخی عمل سے مربوط نہ ہو جائے۔

شاید یہ بات قرآن مجید کی اس آیت سے واضح ہو جائے جہاں اللہ کی محبت اور رسولؐ کی محبت کو جہاد فی سبیل اللہ سے مربوط کر دیا گیا ہے۔ آپؐ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں اور خاندان اپنا جمع کردہ مال، وہ تجارت جس کی کساد بازاری سے تم ڈرتے ہو اور وہ گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو۔ اللہ، اس کے رسول اور اس کے راستے میں جہاد سے زیادہ محبوب

ہیں تو انتظار کرو کہ اللہ اپنا فیصلہ لائے۔

گویا جہاد یعنی اس بت کی اہلیت اور قابلیت کہ ہر اعتبار سے اس ابدی پیام کو دنیا کی زندہ حقیقت بنا دیا جائے، اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت سے مربوط ہے یہی ''لذت آشنائی'' ہے۔ جو مومن کو دو عالم سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ اور شہادت'' اقبال کے الفاظ میں ''دوست کی طرف'' سفر بن جاتی ہے۔

جنگ مومن چیست ہجرت سوئے دوست
ترکِ عالم اختیار کوئے دوست

بات محبت کی ہو اور اس کا سلسلہ جہاد تک چلا جائے، شاید کچھ بے محل سی معلوم ہو۔ لیکن کیا یہ محبت کا تقاضا ہو سکتا ہے کہ محبوب سے دشمنی اور اس کے پیام کی کھلی مخالفت کو روا رکھا جائے۔ اگر کوئی اسے قاہری کہتا ہے تو مجھے اقبالؔ کے حوالہ سے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ یہ قاہری بھی محبت کی آفریدہ ہوتی ہے ''مومن از محبت قاہر است'' محبت کا کمال یہی ہے کہ محبوب کے دشمنوں سے کسی صلح کو روا نہ رکھا جائے، شیفتگی اور وارفتگی، چاپلوسی اور شر کی قوتوں سے کسی سمجھوتہ بازی پر آمادہ نہیں کر سکتی۔

شاید یہ بات تو اونچے درجہ اور عزیمت کی ہے لیکن کیا اس سے کم درجہ میں محبت کا تقاضا غیرت اور حمیت نہیں ہے۔ صحابۂ کرامؓ کی زندگیاں راہ محبت مین عزیمت اور استقامت کی اعلیٰ منزلیں ہیں۔ لیکن اس کے بعد کی تاریخ میں ایسے قابلِ فخر نمونے مل جاتے ہیں جو محبت کے نتیجہ میں غیرت اور حمیت کی آئینہ دار ہیں۔ سرسید پر مذہبی حلقوں کی جانب سے کیا کیا نہ اعتراضات کئے گئے۔ سر ولیم میمور کی کتاب حضور اکرم ﷺ کے بارے میں قابلِ اعتراض باتیں پڑھنے کے بعد سرسید کی غیرت وحمیت جوش میں آ گئی۔ اور ان عالمان ذی احترام سے اس کا جواب نہ بن پڑا جو سرسید کو دہریہ، نیچری، کرسٹان اور نہ جانے کیا کیا کہتے۔ اس کتاب کا جواب لکھنے میں جو صعوبت اور تکلیف سرسید نے برداشت کی اس کا تذکرہ چھوڑیئے سوال صرف یہاں اتنا ہے کہ کیا ان لوگوں کا دعویٰ محبت جو اسلام اور اس کے رسولؐ کے نام پر کفر کا فتویٰ دیتے رہے، سرسید کی غیرت اور حمیت کی برابری کر سکتا ہے؟ کیا محبت آپؐ کے لائے ہوئے پیام اور حق کی مظلومیت کو گوارا کر سکتی ہے اور آپؐ کے نام لیواؤں پر ظلم وستم کو برداشت کر سکتی ہے؟

محبت اور عشق کے راستے میں غیرت اور حمیت کی ایک مثال، اقبال کی زندگی میں پیش آنے والے دو واقعات میں بھی ملتی ہے، جس کا اظہار اقبالؔ کی نظم، لاہور اور کراچی،، میں ہوا ہے ۔ لاہور کے ایک نوجوان غازی علم الدین کی غیرت سرکارِ دو عالم ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والے کے وجود کو برداشت نہ کرسکی اور اس غیرت کے نتیجہ میں اس نے موت کو گلہ سے لگالیا۔ اسی طرح ایک واقعہ عبدالقیوم نامی ایک اور نوجوان سے پیش آیا جو کراچی میں وکٹوریہ گاڑی چلاتا تھا۔ جب اسے موت کی سزاء سنائی گئی تو اس نے جج سے مخاطب ہو کر کہا۔ جج صاحب! میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مجھے موت کی سزا دی۔ یہ ایک جان کس گنتی میں ہے اگر میرے پاس دو لاکھ جانیں بھی ہوتیں تو ناموسِ رسولؐ پر نچھاور کر دیتا۔ اس سزائے موت کو عمر قید میں بدلنے کی، وائسر ائے سے سفارش کرنے کے لئے کراچی کے سربراہوں کا ایک وفد اقبالؔ کے پاس آیا۔ ساری کاروائی سننے کے بعد اقبالؔ نے پوچھا۔ کیا عبدالقیوم کمزور پڑ گیا ہے؟ وفد کے ارکان نے کہا ''نہیں وہ تو اپنے اقدام کا اقبال کرتا ہے اور کھلے طور پر کہتا ہے کہ میں نے شہادت خریدی ہے ۔ یہاں اقبالؔ کا جواب بڑا پر اثر ہے۔ جب وہ کہہ رہا ہے کہ میں نے شہادت خریدی ہے تو میں اس کے اجر و ثواب کی راہ میں کیسے حائل ہو سکتا ہوں۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں ایسے مسلمان کے لئے وائسرائے کی خوشامد کروں جو زندہ رہا تو غازی ہے اور مر گیا تو شہید۔ اس پس منظر میں اقبالؔ کی نظم ''لاہور اور کراچی'' کو دوبارہ پڑھئے۔

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمانِ غیور
موت کیا شئے ہے ؟فقط عالمِ معنی کا سفر
ان شہیدوں کی دیت اہلِ کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر
آہ! اے مرد مسلماں تجھے کیا یاد نہیں
حرفِ ''لا تدع مع اللہ الھا'' آخر

محبت کا دعویٰ کرنے والوں کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ اسے صرف ''قال'' تک محدود نہ کر دیا جائے کیوں کہ کبھی کبھی محبت کا ثبوت ''بہ خاک و خون غلطیدن'' کی رسم ادا کر کے دینا پڑتا ہے۔ مجھے شدت احساس میں بھی یہ خیال دامن گیر ہے کہ انفرادی زندگی میں روحانی

ارتقاء کی اعلیٰ منزلوں سے ہمکنار کرنے میں اس جذبۂ عشق ومحبت کو میں نظر انداز نہیں کر رہا ہوں اور نہ ایسا ہوسکتا ہے بلکہ یہاں میرا مقصد اس نسبت اور وابستگی کے دوسرے پہلو کو بھی پیش کرنا ہے کہ اس ذات ختمی مرتبتؐ کی اتباع نہ صرف ذاتِ ازلی سے رشتہ کو استوار کرتی ہے بلکہ اس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اپنے دور کی اجتماعی زندگی میں میں اس کی معنویت کو سمجھا جائے۔ محبت کا استغراق نہ صرف محبوب کی صفات وفضائل کی پیروی بلکہ اس کے پیام کے مقصد ومنشاء کی تکمیل میں آگے بڑھنا بھی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات یہ ہے کہ خاتم النبین ﷺ کی ذاتِ گرامی سے وابستگی ہی ساری امت کے اتحاد کی بنیاد ہے آپؐ سے محبت ہی میں اس رشتہ کی استواری مضمر ہے۔ اقبالؔ نے کیا خوب بات کہی ہے۔

فرواز حق وملت ازوئے زندہ است

اس کا مطلب یہ ہے کہ ملت کی حیات اجتماعیہ کا دارومدار رسولِ اکرمؐ سے وابستگی ہی میں ہے۔ لیکن آج کیا یہ عملاً نہیں ہورہا ہے کہ امت کے مختلف گروہوں میں جزوی اور فروعی مسائل پر اختلاف، اسی سنت کی اتباع اور محبت کے نام پر پیدا کیا جاتا ہے۔ درودوسلام کے نام پر بھی آپس میں نفرت کی دیواریں کھڑی کی جاتی ہیں، ایک دوسرے پر برسرعام طنز وطعن کو روا رکھا جاتا ہے۔ اس قسم کے اختلاف کے لئے محبتِ رسولؐ کے نام پر، اتباع سنت کے نام پر آپس میں کسی خلیج کو پیدا کرنے کی کوشش صرف دشمن طاقتوں کی مدد کرسکتی ہے۔ رمز شناس رسولؐ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کیا اچھی بات کہی ہے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ صحابہؓ میں (فروعی مسائل پر) اختلاف نہ رونما ہوتا۔ کیوں کہ اگر فروعی مسائل میں صحابہؓ کا ایک ہی قول ہوتا تو لوگوں کو اس سے بڑی تکلیف ہوتی۔ صحابہ کرامؓ ائمہ دین تھے جن کی پیروی موجب خیر وبرکت ہے اور باعثِ فلاح ونجات ہے۔ اس بناء پر اگر کوئی شخص کسی بھی صحابی کے قول پر عمل کرے گا تو اسے سنت تصور کیا جائے گا، رسول اکرم ﷺ سے سچے عشق اور محبت کے اعلیٰ نمونے صحابہ کرامؓ کی زندگیوں کے علاوہ اور کہاں مل سکتے ہیں لیکن اس محبت کا ثبوت، جانثاری کے جس انداز سے دیا گیا وہ قابلِ غور ہے، یہ بلالؓ تھے جن کی اذاں عشق کا ترانہ بنی، یہ صدیقؓ تھے کہ جب عتبہ بن ربیعہ نے ان کے چہرے پر پھٹے ہوئے جوتوں سے پیہم ضربیں لگائیں اور سینے پر سوار ہوکر اس قدر زدوکوب کیا گیا کہ ان کی حالت اتنی

نازک ہوگئی کہ بنوتمیم کے لوگ انہیں اس حال میں ایک کپڑے میں اٹھالائے کہ ان کی موت میں کوئی شبہ نہ تھا لیکن ہوش میں آتے ہی سب سے پہلے انہوں نے رسولِ اکرمؐ کی خیریت دریافت کی، انہیں اطمینان دلانے پر بھی چین نہ آیا اور کہا کہ خدا کی قسم میں اس وقت تک کھانے اور پانی کو ہاتھ نہ لگاؤں گا جب تک رسولِ خداؐ کے دیدار سے اپنی آنکھیں روشن نہ کرلوں، لیکن صدیقؓ کی یہی محبت اس انداز سے بھی جلوہ گر ہوئی کہ وقت آنے پر اپنی ساری دولت، اپنا سارا اثاثہ محبوبؐ کے قدموں پر نچھاور کردیا اور خود زبانِ رسالت سے اہل وعیال کے لئے کچھ چھوڑنے کے بارے میں ارشاد ہوا تو جواب ملتا ہے۔

پروانے کو چراغ، ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لئے ہے، خدا کا رسول بس

محبت کے نتیجہ میں یہ عمرؓ کی حمیت تھی کہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلے سے راضی نہ ہوکر آپ سے رجوع ہونے والے شخص کا فیصلہ تلوار سے کیا۔ یہی محبت عثمانؓ کے ایثار وقربانی سے جھلکتی ہے۔ عشق کا یہی تقاضا تلواروں کی چھاؤں میں علیؓ کے بستر مبارک پر لیٹ کر لوگوں کو ''امانت'' پہنچادینے کی ذمہ داری قبول کرنا ہے۔

پورے غزوات کے واقعات کو پڑھ جائے اندازہ ہوگا کہ محبت اور عشق کی بات کیسے ادا کی جاتی ہے۔ تفصیل کا موقع نہیں صرف احد کے غزوہ کو دیکھئے کے عشقِ رسولؐ میں صحابہ کرامؓ نے کس جانثاری کا مظاہرہ کیا جب دشمنوں کے دل کے دل حضور اکرم پر یلغار ﷺ کرنے لگے تو زیادؓ بن سکنؓ انصاریوں کے ساتھ حفاظت کے لئے آگے بڑھے۔ کئی انصاریوں نے اپنی جانیں قربانی کردیں۔ آخری وقت زیادؓ بن سکن کو حضور اکرمؐ کے پاس اس حالت میں لایا گیا کہ وہ زخموں سے چور تھے انہوں نے آخری کوشش کرکے اپنے سر کو پائے مبارک پر رکھ دیا۔ اسی میدان کارزار میں ایک صحابیہ اُم عمارہؓ نے تلوار کا وار اپنے کاندھے پر لے لیا۔ یہی احد کا معرکہ ہے جس میں ابو دجانہؓ نے اپنی پیٹھ کو ڈھال بنادیا۔ اور ابوطلحہؓ نے اپنے ہاتھوں سے تلواروں کے وار کو روکا۔ احد کا یہی معرکہ ہے کہ ایک سیدھا سادہ مسلمان اس سارے منظر کو دیکھ کر عرض کرتا ہے کہ اگر میں لڑتا ہوا قربان ہوجاؤں تو کیا مجھے جنت ملے گی۔ اثبات میں جواب ملنے پر یہ کہتا ہوا معرکہ میں شریک ہوجاتا ہے کہ ''اگر میں نے ان کھجوروں کو کھانے کی مہلت پالی تو بڑی عمر پالی''۔ سعد بن ربیعؓ کی

تلاش کی جاتی ہے وہ زخموں سے چور جاں بلب ہیں، دربارِ رسالتؐ میں سلام شوق پہنچانے کی گذارش کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو یوں متنبہ کرتے ہیں کہ تم میں ایک آنکھ بھی دیکھنے والی موجود ہوئی اور رسول اللہ ﷺ تک دشمن کے ہاتھ پہنچ گئے تو یاد رکھو کہ بارگاہِ الٰہی میں کوئی عذر سنا نہ جائے گا۔ احد ہی کی بات ہے کہ ایک صحابیہؓ کو ان کے باپ، بھائی اور شوہر کی شہادت کی اطلاع دی جاتی رہی لیکن ہر حادثۂ جانگداز کو سننے کے بعد ان کی زبان پر یہی سوال تھا کہ ''رسول اللہؐ کیسے ہیں؟ جب آپؐ کی خیریت کی اطلاع دی جاتی ہے تو فرماتی ہیں کہ آپ کے ہوتے ہوئے ساری مصیبتیں ہیچ ہیں۔

ان مثالوں سے بات کو طوالت دینا مقصود نہیں بلکہ صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ محبت، اتباع اور اطاعت کا اظہار کس انداز سے کیا گیا۔ اور اس کے حقیقی تقاضے کیا ہیں۔

☆☆☆

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰؐ سے مجھے

معراج مصطفویؐ نہ صرف تاریخ اسلام بلکہ ساری انسانیت کا ایک عظیم انقلاب آفریں واقعہ ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی ابتدائی آیات اور سورۂ نجم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ بغیر کسی مادی وسائل کے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک تشریف لے جاتے ہیں۔ روشنی سے زیادہ سبک خرام سواری میں افلاک کی سیر فرماتے ہیں۔ آیات سماوی کا مشاہدہ فرماتے ہیں حقائق کبریٰ کی یافت ہوتی ہے۔ قرب الٰہی کی اعلیٰ ترین منزل تک رسائی ہوتی ہے۔ اس حال میں کہ قرآن مجید گواہی دیتا ہے کہ ما زاغ البصر وما طغیٰ (نہ نگاہ جھپکی اور نہ نظر بھٹکی) وقت اور فاصلہ کی ناقابل تصور وسعتیں سمٹ کر ایک لمحہ اور ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ اس واقعہ کی کئی انداز سے تعبیریں کی گئیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس واقعہ عظیم کے چند اہم پہلو عموماً روایات میں گم ہیں۔ جہاں تک نبوت کے روحانی مقام کا تعلق ہے۔ عارفان اسلام نے معراج کے بارے میں اسرار و نکات بیان فرمائے ہیں۔ لیکن عموماً اس پر کم اظہار ہوا ہے کہ معراج نبویؐ کے کیا اثرات انسانی تاریخ پر مرتب ہوئے۔

نبوت کا اہم منصب تاریخ انسانی کی صورت گری ہے۔ ایک ایسی اخلاقی فضاء کی تخلیق ہے جہاں فرد اپنے کمالات کو پہنچتا ہے۔ معراج جہاں نام ہے افلاک کی تسخیر کا، زماں اور مکاں کی زنجیروں کے ٹوٹنے کا، قرب الٰہی کی اعلیٰ ترین منزل کا، وہی اس کا ایک ارضی پہلو بھی ہے جس کا زندگی اور انسانی تقدیر سے گہرا اور معنوی ربط ہے۔

اس پس منظر میں آج میری تقریر کا موضوع یہ ہے کہ معراجِ مصطفویؐ کے تہذیبی پہلو کیا ہیں؟ اس واقعۂ عظیمہ نے تمدنِ انسانی پر کیا انمٹ نقش چھوڑے ہیں اور اسلام کے سیاسی اور سماجی اظہار میں اس واقعہ کا کیا اثر ہے؟

سب سے پہلے جو بات قابل غور ہے، وہ معراج مصطفویؐ کا زمانی پہلو ہے، یعنی حضور اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے کس مرحلہ میں یہ واقعہ پیش آیا۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ واقعہ حضورؐ کی مکی اور

مدنی زندگی کے درمیان ایک اہم کڑی ہے۔

حضور اکرمؐ نے جب صفا کی چوٹی سے حق کی آواز بلند کی تو وہی مکہ اس ذاتِ گرامی کا دشمن اور مخالف بن گیا جس کو اس نے صادق اور امین کہا۔ کسی معجزہ سے زیادہ خود اس ہستی مقدس کی زندگی صداقت کا معیار تھی، تب ہی تو قرآن مجید کے الفاظ میں مکہ کے لوگوں کے سامنے یہ اعلان کیا گیا۔ ''میں نے تمہارے ہی درمیان عمر گذاری ہے۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے''۔ لیکن جن کے کان حق کی آواز کو سننا نہ چاہتے ہوں، جن کی آنکھیں کھلی حقیقت کو نظر انداز کرنا چاہتی ہوں اور جن کے دل حق کو قبول کرنے کی صلاحیت سے عاری ہو چکے ہوں انہوں نے مخالفت کی ہر ممکن کوشش کی۔ شخصی حملے کئے گئے، ذہنی اور جسمانی اذیتیں دی گئیں، جاں نثاروں پر ظلم وستم کے ایسے پہاڑ توڑے گئے جن کے تذکرہ سے انسانیت لرزہ براندام ہو جاتی ہے۔

معراج سے قبل مکی دور کے آخری تین سالوں میں ظلم وستم، تعذیب اور مصائب اپنی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں ساتویں سن بعثت کے آغاز میں حضور اکرم ﷺ اپنے جاں نثاروں کے ساتھ ایک گھاٹی میں بند کر دیئے جاتے ہیں۔ بھوک اور پیاس سے بچے بلبلا اٹھتے ہیں۔ نہ صرف درختوں کے پتے بلکہ خشک چمڑے کو پاک کر کے بھون کر کھانے کی نوبت آتی ہے۔ اپنے فدائیوں کی اس تکلیف اور مصیبت کو دیکھ کر حضور اکرم ﷺ کے قلب مطہر کی کیا کیفیت ہوگی؟ اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ اپنے صحابیوںؓ کے ساتھ کہیں پیدل تشریف لے جا رہے ہیں، آپ کی یہ عادت مبارکہ تھی کہ آپ قدرے تیز رفتار تھے، لیکن آپ نے اپنی رفتار سست فرمالی۔ صحابہؓ استفسار کیا کہ حضورؐ خلاف عادت آپ آہستہ کیوں چل رہے ہیں۔ زبانِ رسالت سے ارشاد ہوا کہ کیا تم نہیں دیکھتے کہ میرے آگے ایک بوڑھا یہودی جا رہا ہے۔ مجھے خیال ہوا کہ اگر میں تیز چلتا ہوا اس کے آگے نکل جاؤں تو کہیں اس کو اپنی عمر رفتہ یاد نہ آجائے، کہیں وہ سوچنے پر مجبور نہ ہو جائے کہ کاش میں بھی جوان ہوتا، کاش میں بھی توانا ہوتا، کاش مجھ میں اتنی قوت ہوتی کہ میں بھی تیز چل سکتا مجھے خیال ہوا کہ کہیں میری تیز رفتاری سے اس بوڑھے یہودی کے دل پر چوٹ نہ پڑے حضور اکرم ﷺ کو ایک یہودی کی خاطر کا اتنا پاس ہے تو اپنے جاں نثاروں کی اس کڑی آزمائش پر آپ کے لطیف احساسات اور دلسوزی کی کیا کیفیت ہوگی؟ کوئی تین سال کے عرصہ کے بعد ابتلاء اور مصائب کا

یہ دور ختم ہی ہوا تھا کہ ابو طالب کا انتقال ہو جاتا ہے۔ ابو طالب کی اخلاقی تائید وحمایت کی دشمنوں میں بڑی اہمیت تھی، ایک نہیں چار وفود سردارانِ قریش نے ابوطالب کی خدمت میں روانہ کئے گئے کہ آپ اپنے بھتیجے کی تائید سے دستبردار ہو جائیں جب قتل کی دھمکی دی گئی تو ابو طالب لڑکھڑا گئے اور پکار اٹھے، اے میرے بھتیجے مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جسے میں سہار نہ سکوں لیکن زبان رسالت سے یہ پرعزم آواز آئی چچا جان اگر میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند رکھ جائے تو بھی میں اس کام سے باز نہ آؤں گا یا تو یہ کام انجام پا کر رہے گا یا میں اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر دوں گا۔

اس پر استقامت اعلان کے بعد ابو طالب کی حمایت کو توڑنے کی ساری سازشیں اور تدبیریں ناکام ہو گئیں۔

ابو طالب کے انتقال کے چند دن بعد ہی حضرت خدیجہؓ داغ مفارقت دی گئیں، ان کی جدائی کا غم کوئی معمولی غم نہیں تھا، یہ وہ تھیں جنہوں نے سچی رفاقت کا حق ادا کیا، جنہوں نے اپنی ساری دولت وثروت کو حضور ﷺ کے قدموں پر نچھاور کر دیا، جنہوں نے آپ کی رسالت کی سب سے پہلے تصدیق کی یہ دو صدمات ایسے تھے کہ اس سال کو عام الحزن ''یا غم واندوہ کا سال بھی کہا جاتا ہے شعب ابی طالب اور عام الحزن کے بعد سب سے بڑی آزمائش ابھی باقی ہے۔ وہ طائف کا سفر ہے، لیکن یہاں بھی کیا جواب ملا، رحمت اللعالمین کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا گیا اس کی تفصیلات کا وقت نہیں ہے۔ غنڈوں کے ایک ہجوم کو پیچھے چھوڑ دیا گیا طنز سے بھر پور دل کو مجروح کرنے والے فقرے کسے گئے، پتھر برسائے گئے اور جسم اطہر سے اتنا خون بہا کہ نعلین مبارک پیوست ہو گئے غشی طاری ہو گئی، یہ مصیبت اتنی کڑی تھی کہ آپؐ نے فرمایا طائف میں میرے مصائب میری امت کے لئے پرسہ کا کام کریں گے۔

اس کرب واضطراب کا اظہار اس دعا سے ہوتا ہے جو آپ نے طائف کی گھاٹی میں فرمائی۔ بارگاہ ایزدی میں اس دعا کا ایک ایک لفظ حضور کی قلبی کیفیات کا آئینہ دار ہے۔ آپ نے یوں دعا فرمائی، اے میرے اللہ! میں تیرے ہی سامنے اپنی بے زوری کا شکوہ کرتا ہوں تیرے ہی آگے اپنی بے سروسامانی کا گلہ کرتا ہوں، دیکھ انسانوں میں، میں کیسا ہلکا کیا گیا؟ لوگوں میں، میری یہ کیسی سبکی ہو رہی ہے۔ اے سارے مہربانوں میں سب سے مہربان مالک!

سن، میری سن، میری قوت! اے میرے رب تو ہی ہے۔ تو مجھے کن کے سپرد کرتا ہے، کیا تو مجھے ان کے نزدیک کرتا ہے جو ہم سے دور ہوتے ہیں، کیا تو نے مجھ کو میرے سارے معاملات کو دشمنوں کے قابو میں دے دیا ہے؟ پھر بھی اگر مجھ پر تیرا غصہ نہیں ہے تو مجھے ان باتوں کی کیا پروا؟ کچھ بھی ہو، میری سمائی تیری عافیت ہی کی آغوش میں ہے اور تیرے چہرے کی وہ جگمگاہٹ جس سے اندھیرے روشنی میں بدل جاتے ہیں، میں اسی نور کی پناہ میں آتا ہوں کہ اسی میں میری دنیا اور میری آخرت کا سدھار ہے۔ مجھ پر تیرا غصہ بھڑکے، اس سے پناہ مانگتا ہوں، مجھ پر تیرا غضب ٹوٹے اس سے تیرے سایہ میں آتا ہوں، منانا ہے، اس وقت تک منانا ہے جب تک کہ تو راضی نہ ہو جائے''۔ یہ ٹوٹے ہوئے دل سے نکلی ہوئی تڑپا دینے والی دعا ہے۔ صفا کی چوٹی کا انکار طائف کی گھاٹی میں انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ یہ پُر سوز اور پُر درد دعا رحمتِ الٰہی کو جوش میں لا دیتی ہے، وہ جو لوگوں میں ٹھکرایا گیا، وہ جس کی دعوتِ حق کو رد کر دیا گیا اب اسے اونچا اٹھایا جاتا ہے، اتنا بلند کیا جاتا ہے کہ قربِ الٰہی کی وہ انتہائی منزل آتی ہے جس کو قرآن مجید نے ''قاب قوسین او ادنیٰ'' کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں معراج کا یہ زمانی پہلو ہمیں اس بات کا سبق دیتا ہے کہ جب آزمائش انتہا کو پہنچ جاتی ہے جب مصائب کا ہجوم ہوتا ہے، جب ظلم وستم اپنی معراج کو پہنچ جاتے ہیں تب کہیں، معراج کا مقام آتا ہے۔

یہ زمانی پہلو حق کی راہ میں قدم رکھنے والوں کو یاد دلاتا ہے کہ آزمائش کے بعد ہی فتح ونصرت وکامرانی کی منزل آتی ہے، یہاں یہ بات یاد رہے کہ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے الفاظ میں کہ حضور اکرم ﷺ کے یہ مصائب اضطراری نہیں تھے بلکہ اختیاری تھے تاکہ حق کے علمبرداروں کو یہ بات سمجھا دی جائے کہ معراج وکمال کا راستہ کن منزلوں سے ہو کر گزرتا ہے۔

اب معراج کے بعد دعوت کی قبولیت اور تسخیر کا دور شروع ہوتا ہے ساری انسانیت تاریخ کے ایک فیصلہ کن موڑ پر پہنچ رہی ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کا آغاز معراج کے تذکرہ سے ہوتا ہے لیکن یہ پورا اسوۂ معراج کے اسرار وحقائق نتائج اور احکامات پر مبنی ہے۔ یہودی پر یہ بات واضح کر دی جاتی ہے کہ بیت المقدس پر اب ان کی تولیت کا استحقاق ختم ہونے کو ہے۔ کفارانِ قریش کے سامنے یہ اعلان ہوتا ہے کہ پند ونصائح کا زمانہ گزر گیا اب فیصلہ حق کا وقت آتا ہے۔ ہجرت

کا اشارہ اسی سورہ کی اس دعا سے ملتا ہے کہ۔

وقل رب ادخلنی مدخلَ صدقٍ واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا (۱۷ : ۸۰)

یہ ارشاد ربانی نصرت وغلبہ کی بشارت لئے ہوئے ہے۔اب باطل کا چل چلاؤ ہے۔

وقل جاء الحق وزھق الباطل ط ان الباطل کا ن زھوقا.(۱۷ :۸)

سچائی اب اپنی پوری معنوی اور سماجی وسعتوں کے ساتھ ظاہر ہونے کو ہے۔

معراج کے بعد بیعت عقبیٰ اولیٰ اور ثانیہ سے اس دعوت کی وسیع پیمانے پر قبولیت کا آغاز ہو جاتا ہے جس کے بعد ہی ہجرت کا مقام آتا ہے۔ جو ایک نئے انقلاب کا آغاز بنتا ہے۔ غارِ حرا کی خلوت غار ثور سے نکل کر دعوتِ حق ایک نئی سماجی تشکیل کا روپ دھارنے کو ہے۔ ہجرت کی اقبال نے ایک نئی توجیہ پیش کی ہے کہ یہ دشمنوں کے نرغہ سے فرار نہیں ہے بلکہ زمین پیوستگی کے خلاف ایک اظہار ہے۔ تسخیر کل عزم ہے، شبن، کی تنک آبی سے نکل تسخیرِ یم کا اعلان ہے اور ثباتِ مسلم کا ایک اہم مرحلہ ہے۔

معراج کے ایک اور اہم تمدنی پہلو کی طرف اقبال نے اپنے پانچویں خطبہ میں اشارہ کیا ہے۔ اس مقام پر انہوں نے مشہور صوفی بزرگ عبد القدوس گنگوہی کے اس قول کو دہرایا ہے کہ ''محمد عربی ﷺ فلک الافلاک پر تشریف لے گئے اور واپس تشریف لے آئے خدا کی قسم میں اس مقام تک جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔

طاقت وتوانائی کے حقیقی سرچشمہ سے قربت کے بعد ایک نبی کی اس دنیائے جہد وعمل میں واپسی اس لئے ہوئی ہے کہ ساری انسانیت کی تاریخ میں ایک انقلاب برپا کیا جائے اقبال کا یہ شعر منصب نبوت کے ان دو اہم پہلوؤں کی بہترین عکاسی کرتا ہے

خودی کی خلوتوں میں کبریائی
خودی کی جلوتوں میں مصطفائی

معراج مصطفویؐ کا یہ پہلو اسلام کے اس تمدنی رخ کا بہترین اظہار ہے کہ کسی فرد کے روحانی تجربہ کی جانچ کا معیار کیا ہے۔ کسی ولی، کسی بزرگ کے روحانی مقام کا یہ معیار قائم ہوتا ہے کہ عام دنیائے انسانیت پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ آیا وہ سکون پسند بنتا ہے یا

اپنی شخصیت کے استحکام کے ذریعہ دنیا کے لئے نفع رسانی کا ذریعہ بنتا ہے۔ خلوت کے ان لمحات میں جہاں وہ خدائے بزرگ و برتر سے نزدیک ہوتا ہے جہاں وہ معرفت کی نئی منزلوں سے ہم کنار ہوتا ہے وہ اس سماج میں، جہد وعمل کی دنیا میں بھرپور حصہ لیتا ہے۔

خلوت وجلوت ایک ہی سالک کے دو مقامات ہیں جن کی تکمیل ایک دوسرے پر منحصر ہے صرف کسی ایک پہلو پر قیام کرنا زندگی کے تقاضوں کا نامکمل اظہار ہے۔

چیت جلوت، درد وسوز آرزو است
انجمن دیداست، و خلوت جستجو است
گرچہ اندر خلوت و جلوت خدا است
خلوت آغاز است و جلوت انتہا است

حضرت عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ ایک سالک خانقاہی نظام میں تزکیہ وتربیت کے بعد مخلوق کی جانب مامور من اللہ ہوجاتا ہے، تزکیہ کے ساتھ ساتھ اللہ کی جانب سے ماموریت کا یہ پہلو آج کی ہماری زندگی میں اوجھل ہوگیا ہے۔

معراج کے واقعہ کے بعد ہی مدنی دور کے آغاز سے قبل اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے بنیادی اصول بتادئے جاتے ہیں۔ شرک سے بچنے کی تاکید کے بعد تمام احکامات خاندانی زندگی، اخلاقی فضاء کی تخلیق، محروموں، غریبوں اور مسکینوں کے مفادات کا تحفظ، دولت کے مناسب استعمال غرض اجتماعی زندگی سے متعلق احکام پر مشتمل ہیں جن پر ایک نئے معاشرہ کو قائم اور استوار کرنے کا مرحلہ درپیش تھا۔

معراج مصطفویؐ کا یہ عظیم واقعہ اس بات کا درس دیتا ہے کہ خدا جوئی، خداشناسی کا سفر، سکون کا لمحہ نہیں ہے بلکہ ایک نئی طاقت اور توانائی کا حصول ہے تاکہ اس قوت اور توانائی کو استعمال کرتے ہوئے الٰہی قدروں کو زمانہ کی زندہ حقیقت بنادیا جائے۔

حضور اکرم ﷺ کو دس سالہ مدنی زندگی میں ۲۷ غزوات میں حصہ لینا پڑا اسکے علاوہ سرایا کی تعداد مورخین نے ۳۵ تا ۶۳ بتائی ہے۔ اگر ہم کم از کم تعداد ۳۵ مقرر کرلیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو دس سال کے دور میں کوئی ۶۲ جنگی مہمات سر کرنی پڑیں جس کا

اوسط کوئی ہر دو ماہ میں ایک جنگی مہم کا ہوتا ہے۔ اسی ایک بات سے ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ آپ کی عملی جدو جہد اور کش مکش کا کیا عالم ہوگا؟

میں زندگی مراقبہ اور مجاہدہ دونوں پہلوؤں پر منحصر ہے۔ یہی معراج مصطفویؐ کا ایک اہم تمدنی پہلو ہے۔ زندگی محض تنہائی کوہ و دمن کا نام نہیں بلکہ سوز و سرور انجمن بھی ہے بدقسمتی سے ہم سے بہت سے لوگوں کے نزدیک کسی شخص کے اللہ والا ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ دنیا کے ہنگاموں سے دور ہو جائے۔ کش مکش اور جدو جہد سے گریز کرے۔ اپنے ماحول سے بے نیاز ہو جائے۔ لیکن فقر کا صحیح تصور یہ ہے کہ عالم تمام مومن جانباز کی میراث ہے مومن کا فقر حالات کے جبر کا نام نہیں ہوتا بلکہ اختیاری اور خالصتاً لوجہ اللہ ہوتا ہے۔ اس توازن کی مثال حضرت علیؓ کی زندگی ہے۔ اقبال حضرت علی مرتضیٰؓ کے اسمائے گرامی کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک طرف تو وہ بوتراب ہیں تو دوسری طرف حیدر کرار، بوترابی نام ہے فقر کا، بے نیازی کا، اقلیم تن کو فتح کرنے کا اور اس کے ساتھ کرّاری ضرب ہائے پے بہ پے کا نام ہے، قوت کے اظہار کا نام ہے۔ شوکت اور عظمت کا اعلان ہے۔ پھر حضرت علیؓ کا ایک لقب یداللہ ہے۔ یداللہی عشق الٰہی کی اس اعلیٰ کیفیت کا نام ہے جہاں بندہ کی مرضی، مولا کی مرضی سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے اور وہ اس عالم رنگ و بو کی تسخیر کرنے والا بن جاتا ہے آپ باب العلم بھی ہیں جس میں کائنات کے ہر پہلو کا علم شامل ہے جو انسانیت کو اس دنیا میں سربلند اور غالب بناتا ہے۔ کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق، کبھی سوز و سرور انجمن عشق، کبھی سرمایۂ محراب و منبر، کبھی مولا علی خیبر شکن عشق۔

اسی معراج میں ساری امت مسلمہ کو حاصل ہونے والا بیش بہا تحفہ اور ایک عظیم نعمت نماز ہے، جو بجائے خود دعا ہے۔ دعا کیا ہے؟ دعا کو مخ العبادۃ۔ یعنی عبادت کا مغز، اس کی روح، یعنی اس کا Essence کہا گیا۔ اقبال کے الفاظ میں ''دعا'' خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی ضمیر انسانی کی اس نہایت آرزو کی ترجمان ہے کہ کائنات کے اس ہولناک سناٹے میں اپنی پکار کا جواب سنے۔ اور خدائے بزرگ و برتر کا ارشاد ہے۔ ''مجھے پکارو میں تمہاری پکار کا جواب دیتا ہوں۔'' یاد رہے دعا کو سلاح المومنین، مومن کا اسلحہ بھی کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعا ایک عزم کا اظہار ہے۔ بہترین دعا جو ہمیں سکھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ۔ ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ۔ دنیا کا سدھار اور اس کے لئے پوری جدو جہد کے لئے نماز کی

خلوت، دعاؤں میں التجا فریاد اسی جدوجہد عمل کے لئے تربیت کا نام ہے۔ مومن جب اس رمز کو سمجھ لیتا ہے تو اس کی اذان ندائے آفاق بن جاتی ہے اور اس کی تکبیر سے شبستانِ وجود لرزنے لگتا ہے۔

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

اگر اس کا یہ تمدنی پہلو نظر انداز ہو جائے تو ہمارے سارے مراقبے، ہماری ساری عبادات اپنے مقصد کی تکمیل سے محروم رہتی ہیں۔

یہ ذکر نیم شبی، یہ مراقبے یہ سرور
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

بات ایک ہی ہے لیکن ہمارے ذہنی رویہ کا تعین بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات
وہ مذہب مردانِ خود آگاہ وخدامست
یہ مذہب ملا وجمادات ونباتات
الفاظ ومعانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

معراجِ مصطفویؐ کے جن پہلوؤں کی جانب میں نے اشارہ کیا ہے اس سے بخوبی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ معراج جو مکی دور کے اختتام اور مدنی دور کے آغاز کے درمیان واقع ہوئی ایک عظیم معنویت اور تمدنی قدر اپنے اندر رکھتی ہے۔ مکی دور میں شانِ عبودیت کا مکمل اظہار ہے اور مدنی دور میں شانِ رسالت کا کامل ظہور ہے۔ واضح رہے کہ زندگی کے یہ دو رخ علیحدہ نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں روحانی ارتقاء کی معراج ایک ایسے ہمہ جہتی انقلاب کا نقطۂ آغاز ہے جہاں ہر طرف کمال ہے حسن ہے، دنیائے رنگ وبو اور اس کی ساری جلوہ آرائیوں کی معراج تخلیق آدم ہے، آدمیت کی معراج انبیائے کرام کا ظہور ہے، انبیائے کرام کی معراج حضور رسالت مآبؐ کا وجود مقدس ہے اور حضور اکرمؐ کی معراج ساری انسانیت کی معراج ہے۔ وہ اسماء وصفات کا مظہر اتم ہیں تکوین اور تخلیق کا آخری اور مکمل نمونہ ہیں اور اس معراج کا اہم پہلو یہ ہے کہ اس کے صدقہ میں ساری انسانیت کے لئے آپ کے نام لیواؤں کے

لئے اس کے فیوض اور برکات کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھول دیئے گئے۔

دنیا میں جہاں کہیں کوئی خوبی ہے، جہاں کہیں حسن وکمال ہے تو گویا وہ نور مصطفیٰ ﷺ سے مستنیر ہے یا کہیں خوب سے خوب تر کی جستجو، تکمیل کیطرف پرواز ہے، کمال کی آرزو ہے تو سمجھ لو کہ اسے نور مصطفیٰ ﷺ کی تلاش ہے۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ وبو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰؐ اُو را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

ماخوذ: سوینئر ۱۹۸۰ء

☆☆☆

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است

(پندرھویں صدی ہجری کے آغاز کے موقع کی گئی تقریر)

ہجرت نبویؐ تاریخ انسانی میں ایک نئے دور کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس واقعہ کی اہمیت کا اندازہ صرف اسی ایک بات سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ جیسی دیدہ ور اور نکتہ رس شخصیت نے اس انقلاب آفریں واقعہ ہی سے اسلامی تقویم کا آغاز کیا۔ آج جب کہ پندرھویں صدی ہجری تقاریب اور جشن کا دنیا میں چرچا ہے۔ عالم اسلام ایک نئے کرب اور اضطراب سے گزر رہا ہے۔ اس موقع پر ہجرت نبویؐ کے اسرار و حکمت کا مطالعہ ہمیں فکر و نظر کی نئی جہتوں سے سمجھنے کا موقع عطا کرتا ہے۔

اصل موضوع پر کچھ عرض کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ نہایت اختصار کے ساتھ ہجرت کے پس منظر کو واضح کیا جائے تاکہ ہجرت کی معنویت اور اس کے دور رس اثرات کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔ غارِ حرا سے غارِ ثور تک یہ سفر مختلف مقامات اور کیفیات کا مظہر ہے۔ غارِ حرا کی خلوت بھی ایک طرح کی ہجرت ہے اقبال کے الفاظ میں یہ ہجرت سوئے حق ہے معرفت کی جستجو ہے۔ لیکن معرفتِ حق کے بعد حرا میں حکم اقراء ہی سے حق کے ابلاغ کا راستہ کھل جاتا ہے اور یہ دعوت اپنے قرابت داروں میں، فاران کی چوٹی پر، مکہ کی گلیوں میں، عکاظ کے میلوں میں، بازاروں میں بیت اللہ کے نواح میں گونجنے لگتی ہے ۔مکی دور کے دس سالہ دور پر ایک طائرانہ نظر ڈالئے ، دیکھئے چشم تصور کن مناظر سے گزرتی ہے۔ دعوتِ حق کا تمسخر ہو رہا ہے، امین اور صادق کو ذہنی اور جسمانی تکلیف پہنچائی جارہی ہے، جانثاروں پر ظلم و ستم کا وہ کونسا حربہ ہے جو آزمایا نہیں جارہا ہے، غرض غارِ حرا سے شعب ابی طالب، شعب ابی طالب سے طائف اور اس درمیان میں عام الحزن جیسی سخت ترین منزل بھی آتی ہے اسی کش مکش اور جدوجہد کے دوران ایسے چند جیالے اس دعوت حق کو قبول کر لیتے ہیں جو ظلم و ستم کی بھٹی میں تپ کر کندن بن کر نکلتے ہیں، خدائے واحد پر غیر متزلزل ایمان نے ان کی زندگی کو منقلب کر دیا، رسول اللہ ﷺ پر ایمان اور اس ذات گرامیؐ سے وابستگی نے سرفروشی اور جانثاری کی وہ کیفیت پیدا کر دی کہ صداقت اور سچائی کی راہ

میں ہر قسم کی قربانی کو ہنستے کھیلتے پیش کریں۔ مکی دور میں مصائب اور تعذیب جب اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ جاتے ہیں تو روحانی ارتقاء کا وہ اعلیٰ مقام آتا ہے جس کو ہم معراج کے نام سے یاد کرتے ہیں معراج جہاں آیات کبریٰ کے مشاہدہ، حقائق اعلیٰ کی یافت اور قربِ الٰہی کے کمال کی منزل ہے وہیں غلبہ کی بشارت اور نصرت کی نوید ہے جس کا ربط ساری تقدیر انسانی سے ہے، اقبال کہتے ہیں کہ روحانی بلندی کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچنے کے بعد ایک نبی کی واپسی، تخلیقی ہوتی ہے۔ پانچویں خطبہ میں اقبال کہتے ہیں ''وہ اس واردات سے واپس آتا ہے تو اس لئے کہ زمانہ کی رو میں داخل ہو جائے اور پھر ان قوتوں کے غلبہ اور تصرف سے جو تاریخ عالم کی صورت گر ہیں مقاصد کی ایک نئی دنیا آباد کرے''۔ اس طرح معراج اور ہجرت میں ایک گہرا اور معنوی ربط ہے، سورۂ بنی اسرائیل میں جس کا آغاز ہی واقعہ اسریٰ سے ہوتا ہے، ہجرت کا اشارہ مل جاتا ہے، ایک ناسازگار ماحول سے نکل کر ایک نئی فضاء میں داخل ہونے اور غلبہ و نصرت کی بشارت ہے۔

ہجرت کا پورا Process معراج کے بعد ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ معراج کے بعد بعثت مبارک کے گیارہویں سال، مدینہ کے ایک قبیلہ خزرج کے ۶ افراد اسلام قبول کرتے ہیں، دوسرے سال یہ تعداد دگنی ہو جاتی ہے اور تیسرے سال بیعتِ عقبۂ ثانیہ کے موقع پر ۷۲ اصحاب رسول اکرمؐ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اور آپؐ کو مدینہ آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ بیعت عام طرح کی بیعت نہیں تھی بلکہ ۷۲ افراد کے اس گروہ میں شامل ہر فرد اس فیصلہ کے نتائج اور عواقب سے بخوبی واقف تھا حضرت عباسؓ نے انتباہ دیا کہ اے یثرب کے لوگو! یہ عرب و عجم کے خلاف اعلان جنگ ہے، سخت خونریز لڑائی کو دعوت دینا ہے، اس وفد کے ایک رکن اسعد بن زرارہؓ کھڑے ہو کر اس بیعت کے نتائج سے اپنے ساتھیوں کو یوں واقف کرواتے ہیں۔ ٹھہرو! اے اہلِ یثرب ہم لوگ انکے پاس آئے ہیں تو اس لئے کہ یہ اللہ کے رسول ہیں اور آج انہیں یہاں سے نکال لے جانا تمام عرب سے دشمنی مول لینا ہے، اس کے نتیجہ میں تمہارے نونہال قتل ہوں گے، تلواریں تم پر برسیں گی، لہٰذا تم اس کو برداشت کرنے کی طاقت اپنے اندر پاتے ہو تو ان کا ہاتھ پکڑو اور اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ لیکن اگر تمہیں اپنی جانیں عزیز ہیں۔ تو پھر چھوڑ دو۔ کیوں کہ اس وقت عذر کر دینا خدا کے نزدیک قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ اس بات کو بانداز دیگر ایک دوسرے رکن عباس بن عبادہؓ یوں دہراتے ہیں کیا تم جانتے ہو کہ اس شخص سے کس بارے میں بیعت کر رہے ہو تم ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے دنیا بھر سے لڑائی مول لے رہے ہو،

پس اگر تمہارا یہ خیال ہو کہ جب تمہارے اموال اور تمہارے اشراف ہلاکت کے خطرہ میں پڑ جائیں تو تم انہیں دشمنوں کے حوالے کر دو گے تو بہتر ہے آج ہی انہیں چھوڑ دو، کیوں کہ خدا کی قسم! یہ دنیا اور آخرت کی رسوائی ہے اور اگر تمہارا ارادہ ہے کہ جو بلا وا تم اس شخص کو دے رہے ہو اس کو اپنے اموال اور اشراف کی ہلاکت کے باوجود نبھاؤ گے تو بے شک اس کا ہاتھ تھام لو کہ خدا کی قسم اس میں دنیا و آخرت کی بھلائی ہے۔

جب وفد کے سارے ارکان اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ وہ اپنے اموال کی تباہی اور اپنے اشراف کی ہلاکت کا خطرہ مول لینے تیار ہیں تو تب کہیں بیعت کی تکمیل ہوتی ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ انصار نے ہر نازک موقع پر اس عہد کو پورا کیا۔

میں نے بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر اس گفتگو کو اس لئے پیش کیا ہے کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ جو دعوت مکہ والوں نے رد کر دی اسے کس طرح مدینہ والے قبول کر رہے ہیں اور ''**واجعلنی من لدنک سلطانا نصیرا**''۔ کی دعا کے جواب میں قبولیت اور تسخیر کے کیا سامان ہو رہے ہیں۔

اس کے بعد ہجرت سے متعلق ساری تفصیلات تاریخ میں محفوظ ہیں۔ مدینہ پہنچ کر مہاجرین کی باز آبادکاری، مواخاۃ، مدینہ کے نواح میں آباد یہودیوں کی بستیوں اور دیگر قبائل سے معاہدے، ان سارے مرحلوں سے گزر کر دنیا کی پہلی اسلامی مملکت کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔ ان واقعات میں سے ہر واقعہ اپنے اعتبار سے منفرد اور بے نظیر ہے۔ تفصیلات کا یہ موقع نہیں ہے بلکہ یہاں میں ہجرت کی حکمت اور اس کے چند انقلابی پہلوؤں کی جانب چند اجمالی اشارے کرنا چاہتا ہوں

☆ یہ بات واضح رہے کہ ہجرت محض نقل مقام کا نام نہیں ہے، دشمنوں کے نرغہ سے نکل کر کسی محفوظ پناہ گاہ کی تلاش نہیں ہے۔ مصائب سے بچ کر کسی گوشۂ عافیت کی آرزو نہیں ہے۔ بلکہ تنگنائیوں سے نکل کر ایک عالمگیر اور ہمہ گیر انقلاب کے لئے ایک مرکز کی تشکیل کا نام ہے منتشر قوتوں کی تنظیم کا نام ہے۔

اقبال کہتے ہیں:

پس چرا از مسکن آباء گریخت
تو گماں داری کہ از اعداء گریخت

قصہ گویاں حق زما پوشیدہ اند
معنی ہجرت غلط فہمیدہ اند
ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است
ایں زا سابِ ثباتِ مسلم است
معنی او از تنک آبی رم است
ترکِ شبنم بہر تسخیریم است
بایدت آہنگِ تسخیر ہمہ
تاتو می باشی فراگیر ہمہ

مسکن آباء سے مراد وطن ہے اور انسانی نفسیات کے اعتبار سے آدمی وطن کی محبت سے سرشار ہوتا ہے لیکن آئین حیات کے مقابلہ میں اس کی اہمیت ثانوی ہوتی ہے۔ یہ عارضی زندگی کا ایک مرحلہ ضرور ہے لیکن ابدیت کے وسیع تناظر میں ہجرت زمین پیوستگی (Earth Rootedness) کے سارے محدود رجحانات کو ختم کر دیتی ہے اور اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اسلام کو زمین کے خانوں میں مقید نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ یہ امت مکان کی پابند space bound نہیں ہے۔ ہجرت کی بنیاد پر پندرھویں صدی تقاریب منانے والے عالمِ اسلام کے بیشتر ملکوں کے لئے ہجرت کا یہ پہلو لمحۂ فکر فراہم کرتا ہے کہ مسکن آباء کا یہ تصور، وسیع تر امت کی تشکیل میں کس کس انداز سے حارج ہو رہا ہے۔ س میں کوئی شک نہیں ہے کہ نسل، قوم اور وطن شناخت کا ذریعہ ہیں لیکن ہجرت کے ذریہ اس اساسی انقلاب کی بنیاد رکھ دی گئی جو خالص روحانی اور انسانی بنیاد پر تشکیل پاتا ہے۔

☆ ہجرت ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ اسلام سارے خونی رشتوں سے بھی بالاتر ہونے کا نام ہے ۔اس کی تشکیل صرف کلمہ طیبہ کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ ہجرت ہی کی بات ہے کہ حضرت ام سلمہؓ اپنے شوہر اور شیر خوار بچے سے بچھڑ کر رہ گئیں اور تقریباً ایک سال تک ان کی دلگداز آہیں اس مقام پر بلند ہوتی رہیں جہاں وہ اپنے بچے اور شوہر سے جدا کر دی گئی تھیں۔ عرب کے اس معاشرہ میں جہاں قبیلہ کے کسی فرد کے قتل پر نسل در نسل بدلہ کا سلسلہ جاری رہتا کیسی انقلابی تبدیلی آ گئی، اس کا اندازہ صرف ایک ہی واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ جو ہجرت کے چند ماہ بعد ہی غزوۂ بدر کے مقام پر پیش آیا۔

غزوۂ بدر کا موقع ایسا ہے کہ اپنے ہی خونی رشتہ داروں، خاندان والوں اور قبیلہ والوں سے

لڑائی ہے۔فرقِ کفراورایمان کا ہے۔اس لڑائی کی یادتازہ کرتے ہوئے ایک دفعہ حضرت صدیقؓ کے صاحبزادہ نے جواس وقت تک مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے اپنے والدمحترم سے فرمایا کہ ایک موقع پرآپ میری تلوار کی زد پر تھے لیکن باپ کی محبت غالب آگئی اور میں نے آپ کو چھوڑ دیا۔حضرت صدیقؓ جواب دیتے ہیں کہ بیٹے! یہ تمہارے کفر کی کمزوری تھی اگرتم میری زد پر ہوتے تو میں تمہیں کبھی نہ بخشتا۔

ہجرت نام ہے جانی دشمنوں تک بھی امانت پہنچادینے کا۔قتل کا منصوبہ بنائے ہوئے،مشرکین بیت اطہر کا محاصرہ کئے ہوئے ہیں،لیکن ننگی تلواروں کی چھاؤں میں آپ حضرت علیؓ کو اپنے بستر مبارک پرلٹادیتے ہیں کہ حق داروں تک ان کی امانت پہنچادیں۔دین اسلام بھی مہاجر نبیؐ کے نام لیواؤں کے پاس ایک امانت ہے جسے حق داروں تک پہنچادینا انکا فرض منصبی ہے۔

☆ ہجرت نام ہے اللہ اورس کی نصرت پر مستحکم یقین کا۔حق کے لئے جدوجہد کے راستہ میں جب کبھی تم دیکھو کہ دشمن تمہارے سروں پر آپہنچا ہے۔تم دشمنوں کے نرغے میں پھنس چکے ہوتو یادرہے کہ آج بھی غارِثور سے بلند ہونے والی یہ صدا فضامیں گونج رہی ہے کہ" لا تحزن ان الله معنا "

☆ ہجرت نام ہے اپنے اموال،اپنی جائدادوں اوراپنی مرغوب متاع کوراہِ خدامیں ترک کرنے اوردین کی نصرت میں اپنے مال کوقربان کرنے کا۔

اوراس سے بڑھ کرکبھی اپنی جان کوآفریں کے سپرد کردینا بھی ہجرت سوئے دوست ہے

جنگ مومن چیست ہجرت سوئے دوست
ترکِ عالم اختیار کوئے دوست

☆ ہجرت نام ہے اللہ کی راہ میں جدوجہد کے لئے منتشر قوتوں کی شیرازہ بندی کا۔ایک مستحکم مرکز سے قریب رہنے اوراسے تقویت دینے کا۔ہجرت کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہونے والوں کواس بات کی تاکید تھی کہ وہ اپنے مستقر کوچھوڑتے ہوئے مدینہ میں آبسیں۔اس حکم پر پابندی فتح مکہ تک جاری رہی۔

☆ ہجرت ہی میں اس فراست اورحکمت کا درس پوشیدہ ہے کہ جب قوی دشمن سے مقابلہ ہو توحق کی قوتوں کوتقویت دینے کے لئے کیاحکمتِ عملی اختیارکی جائے۔کس طرح غیر جانبدارقوتوں کو دشمنوں کا حلیف بننے سے روکا جائے اوران کی اخلاقی تائید کیسے حاصل کی جائے۔یہودیوں اوردیگر

قبائل سے کیا گیا معاہدہ فراستِ نبوی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

آج بھی جب کہ مختلف خطوں میں بٹے ہوئے مسلمان مختلف متصادم قوتوں سے نبرد آزما ہیں، انہیں یہ مرحلہ درپیش ہے کہ موجودہ صورتِ حال سے کس طرح نمٹیں، ہماری توجہ صرف مخالفین پر اتنی مرکوز ہو جاتی ہے کہ ہم ایسی قوتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو عبوری مدت ہی کے لئے سہی ہماری طرف دار بن سکتی ہیں یا جس کی اخلاقی تائید ہم حاصل کر سکتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسے موقع پر جب کہ کسی خیر کے انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کسی کم تر برائی کا انتخاب ہی ہماری فراست کا امتحان بن جاتا ہے۔ اس حکمتِ عملی کا یہ پہلو بھی ہے کہ جب اسلامی قوتیں موثر اور متصرف ہو جاتی ہیں تو اندرونی استحکام کے ساتھ ساتھ اپنے وسائل کو بھرپور انداز میں استعمال کرنے میں دیر کرنی نہیں چاہیے۔ بلکہ وقت پڑنے پر اپنے اثر و قوت کو محسوس بھی کروانا چاہئے تا کہ مخالف کو اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔ مدینہ میں ایک نئے سیاسی نظم کی تشکیل کے بعد یمن سے شام کی تجارتی شاہراہ مسلمانوں کی زد پر آ گئی۔ قریش کی تجارت کا دارومدار اسی شاہراہ پر تھا۔ اس موقف کو مشرکین مکہ پر ظاہر کر دیا گیا۔ چنانچہ جنگ بدر سے قبل سعد بن معاذؓ جب عمرہ کے لئے مکہ تشریف لے گئے تو حرم کے دروازہ پر ابوجہل نے روک دیا اور کہا کہ تم ہمارے باغیوں کو پناہ دیتے ہو، ان سے تعاون اور نصرت کا دم بھرتے ہو اور اس کے باوجود تم یہ چاہتے ہو کہ ہم تمہیں چین سے مکہ میں طواف کرنے دیں۔ سعدؓ نے جواب میں کہا اگر تم نے مجھے اس سے روک دیا میں تمہیں اس چیز سے روک دوں گا جو تمہارے لئے اس سے شدید تر ہے (یعنی مدینہ سے تمہاری رہ گذر)۔ جہاں جہاں مسلمان اس موقف میں ہیں کہ وہ اپنے اثر اور موقف کو امتِ مسلمہ کی تائید میں محسوس کروا سکیں ان کے لئے ہجرت کی یہ حکمتِ عملی ایک لمحۂ فکر فراہم کرتی ہے لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ بیشتر ممالک نہ تو اپنے حقیقی داخلی استحکام پر متوجہ ہیں اور نہ اپنے وسائل کی قوت کو حق کی نصرت کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں بلکہ ان نام نہاد مسلم ممالک میں زور اس بات پر ہے کہ اگر اسلام کے نام پر اقتدار مل جائے تو کسی طرح ذاتی اقتدار کے استحکام کی کوشش کریں۔

میں نے نہایت اختصار کے ساتھ ہجرت سے متعلق چند اہم پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور آخر میں ایک بات کی طرف توجہ کا طالب ہوں کہ سیرتِ طیبہ محض تاریخ کا گزرا ہوا لمحہ نہیں ہے بلکہ ابدی سرچشمہ ہدایت کے اعتبار سے اس حیاتِ طیبہ کا ہر نقش ہماری اجتماعی جدوجہد کے سفر میں روشنی کا مینار ہے۔ جس طرح ہجرت، مصائب کے ہجوم میں ایک عالمگیر اور ہمہ گیر انقلاب کا نقطۂ آغاز بنی،

اسی طرح عالم اسلام کی موجودہ اضطرابی کروٹیں بیداری کی بشارت بن سکتی ہیں لیکن شرط یہی ہے کہ ہم اپنے ذہن کی تنگنائیوں سے نکل کر وسیع تر فضاؤں میں آئیں۔ دین کی محدود تاویلات میں الجھتے رہنے کی بجائے اعلیٰ تر نصب العین کا ادراک کریں اور ان قوتوں کو مجتمع کرنے کا ذریعہ بنیں جو ساری انسانیت کی تعمیر نو کے لئے ضروری ہیں۔ غارِ حرا سے غارِ ثور تک سفر طئے کرنے کے بعد ہی ایک نئی صبح کی نوید ہے۔

(سونیر ۱۹۸۱ء)

☆☆☆

عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللہ علیہ وسلم

اشھد ان محمدا عبدہٗ ورسولہٗ (میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے عبد اور رسول ہیں، کلمہ شہادت کے دوسرے جزو میں حضور اکرمؐ کی ذات گرامی کے بارے میں عبدہٗ ورسولہ، کے ان دو پہلوؤں کی شہادت بڑی بلیغ اور معنی خیز ہے۔ یہ سوال بڑا اہم ہے کہ اس شہادت کی معنویت کیا ہے؟ اس لئے کہ یہ گواہی نہ صرف آپؐ کی شخصیت کے مرتبہ ومقام کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے بلکہ اس عظیم اور دوامی اسوہ حسنہ کے بارے میں ہمارے ذہنی رویہ کو بھی متعین کرتی ہے، اور خود دین کی تعبیر اور تفہیم میں یہ گواہی بڑی معنویت کی حامل ہے۔ دوسری طرف یہ شہادت ہمیں اس ذمہ داری سے بھی آگاہ کرتی ہے جو بہ حیثیت شاہد ہم قبول کرتے ہیں۔ اس لئے اس بات کا سمجھنا ہمارے لئے ضروری ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام عبدیت اور مقام رسالت کے ان دو پہلوؤں کی شہادت کا مفہوم اور اس کے تقاضے اور مطالبات کیا ہیں؟

تاریخ مذاہب کا مطالعہ ہمیں اس غیر متوازن صورت حال سے روشناس کراتا ہے جو انبیائے کرام کی شخصیتوں کے بارے میں افراط اور تفریط کا نتیجہ ہوتا ہے، شاید یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ کسی نہ کسی انداز میں خود ہمارے اندر ایسے رجحانات در آئے ہیں جو ہمیں راہ اعتدال سے ہٹا دیتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ اس مکمل ترین شخصیت کے ان روحانی اور تاریخی بُعد اور ان کے درمیان ربط کو ہم پوری طرح سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں ایک طرف تو ڈانڈے الوہیت سے اس طرح ملا دیئے جاتے ہیں کہ اس کا تاریخی اور ارضی مفہوم نظر انداز ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف سیرتِ طیبہ کے صرف تاریخی پہلو پر ہماری توجہ اس حد تک مرکوز ہو جاتی ہے کہ روحانی پہلو نظروں سے اوجھل رہ جاتا ہے۔ بات شاید یوں واضح ہو کہ حضورِ اکرمؐ کی شخصیت کا ایک بُعد عبدیت کا ہے جو حقیقت کے ازلی اور ابدی سرچشمہ سے مربوط کرتا ہے تو شخصیت کا دوسرا بُعد تاریخی بعد ہے جو عالم انسانیت سے منسلک کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک تعلق مع اللہ ہے اور دوسرا تعلق مع المخلوق ہے۔ ان دو پہلوؤں کو ہمیں اس ذات گرامیؐ spiritual اور Historical DImensions بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ یہ دو

پہلو علیحدہ نہیں بلکہ باہم مربوط ہیں اسی ربطِ باطنی کا استحضار اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کے لئے ضروری ہے۔

یوں تو قرآن مجید میں جگہ جگہ آپ کی صفات وکمالات ،منشائے بعثت اور منصب رسالت کا تذکرہ متعدد مقامات پر کیا گیا ہے،لیکن میں یہاں صرف دو چار آیتوں کی طرف اشارہ کروں گا جو آپ کے مقام عبدیت کو واضح کرتی ہیں۔سورہ بنی اسرائیل کے آغاز میں معراج نبویؐ کے سلسلہ میں ارشاد ہوا ''سبحان الذی اسریٰ بعبدہ''۔روحانی کمالات اور قربِ الٰہی کی اس اعلیٰ ترین منزل پر عبدیت کا اشارہ بڑا معنی خیز ہے۔اسی طرح معراج ہی کے سلسلہ میں سورہ نجم میں یوں ارشاد ہوا۔''فاوحیٰ الیٰ عبدہ مااوحیٰ''۔اسی سورہ کی اور آیتوں پر غور ہمیں اس حقیقت تک رسائی میں مدد دیتا ہے کہ مقام عبدیت حقائق کبریٰ کی دریافت آیات سماوی کے مشاہدات اور قربِ الٰہی کی اعلیٰ ترین منزل تک رسائی سے عبارت ہے)یہاں عبدیت کاملہ کی قرآن مجید یوں شہادت دیتا ہے کہ مازاغ البصر وما طغیٰ۔ (نگاہ نہ تو ہٹی اور نہ بڑھی)

وحی الٰہی اور تنزیل آیاتِ بینات کے سلسلے میں بھی عبدہٗ کے پہلو ہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ''ھو الذی ینزل علیٰ عبدہ آیات بینات ''ایک اور مقام پر فرمایا گیا تبارک الذی نزل الفرقان علیٰ عبدہٖ

عارفین نے کہا ہے کہ حضورِ اکرمؐ کی ذات گرامی سرِ تخلیق ہے۔مظہر لولاک ہے۔وجہ تکوین ہے ،جوہر کائنات ہے، جاوید نامہ میں فلک مشتری پر علاج کی زبان ان اسرار کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں۔

عبدہ، ازفہم تو بالا تراست
زانکہ اُو ہم آدم وہم جوہر است
کس زسرِّ عبدہٗ آگاہ نیست
عبدہ جز سرِ الااللہ نیست
مدعا پیدانگردو زیں دوبیت
تا نہ بینی ازمقامِ ''مارمیت''

اسی سلسلہ میں اقبال نے یوں بھی کہا ہے۔''نگاہ عشق ومستی میں وہی اول وہی آخر۔''

وہی ابتداء بھی ہے وہی انتہا بھی ہے گویا تخلیق اور تکوین کی ابتداء حقیقتِ محمدیہؐ ہے اور اس کی انتہا رسالتِ محمدیہؐ ہے۔ ایک بزرگ نے اس کی مزید تشریح یوں کی ہے کہ مختلف انبیاء کا ظہور دراصل مدارجِ محمدیہؐ کا ظہور ہے۔ آپؐ کا وجود مبارکہ آیہ کائنات کا معنی دیریاب ہے۔

اب مقام عبدہٗ کی اس روشنی میں سیرتِ طیبہ کو دیکھئے کہ ہر آن اللہ سے رشتہ استوار ہے، حقیقت اور صداقت کے سرچشمہ سے ربطِ کامل ہے۔ ایمان ویقین کی پختگی، تسلیم ورضا، سپردگی وتفویض کا معاملہ ہے۔ اس شان عبدیت کا استغراق وانہماک اور بندگی کا سوز وساز، کا مظہر یہ ارشاد گرامی ہے کہ کیا میں اپنے رب کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ ایک حدیث شریف کے یہ چند بلیغ فقرے اس مقام عبدیت کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔ ''المعرفة راس مالی'' (معرفت میرا راس المال یعنی اصل پونجی ہے) ''والحب اساسی'' (محبت میری بنیاد ہے) ''والشوق مرکبی'' (شوق میری سواری ہے) ذکر اللہ انیسی (ذکر الٰہی میرا انیس ہے) نواب بہادر یار جنگؒ کا یہ شعر اس حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے۔

اے کہ ترا سرِ نیازِ حدِّ کمال بندگی
اے کہ ترا مقامِ عشق قربِ تمام عینِ ذات

اب آیئے دوسرے پہلو کی طرف جو تکمیل رسالت کا ہے۔ کمال بندگی اور قربِ تمام عین ذات کے ساتھ ساتھ مخلوق یعنی عالم انسانیت سے رشتہ استوار ہے۔ منصبِ رسالت کے بارے میں قرآن میں یوں ارشاد ہوا ''هو الذی ارسل رسوله بالهدیٰ ودین الحق لیظهره علی الدین کله'' (اللہ نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا کہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دیا جائے)۔ اس تاریخی عمل کی بنیاد انسانیت کے لئے غم خواری ودل سوزی ہے، رحمت اور رافت ہے جس کی شہادت یوں دی گئی ہے۔ آپ کے قلب مطہر پر انسانوں کی تکلیف نہایت شاق گزرتی ہے، جو ان کی فلاح اور نجات کا حد درجہ شائق ہے (لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم حریص علیکم، بالمومنین رؤف رحیم) اور اس رسالت کا منشاء یہی ہے کہ انسانیت کو ہر بوجھ سے نجات اور طوق وسلاسل سے چھٹکارا دلا کر اسے معبود حقیقی سے روشناس کرایا جائے۔

رسولہٗ کی گواہی کے اس مفہوم کو سمجھنا ہو تو آپ حیاتِ طیبہ میں اس تڑپ ودل سوزی، محنت ومشقت، شدائد اور مصائب پر نظر ڈالیں، جو آپؐ نے انسانیت کو جادۂ برحق پر گامزن کرنے کے لئے

برداشت فرمائیں۔ سیرت نگار غزوات کی تعداد، ۲۷ بتاتے ہیں اور چھوٹے اور بڑے سرایا کی تعداد ۳۵ تا ۶۷ بتائی گئی ہے۔ اگر کم از کم تعداد ہی لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ او سطاً ہر دو ماہ کے عرصہ میں ایک جنگی مہم کا سامنا کرنا پڑا وہ ذات گرامی جو وجہ تخلیق ہے، اس کی سچائی اور امانت کی تصدیق کے باوجود اس کی دعوت کو رد کیا جارہا ہے۔ وہ جو سرورِ کونینؐ ہے احد میں زخمی ہورہا ہے، حنین میں تیر اندازوں کا نشانہ ہے وہ جو عبدِ کاملؐ ہے، شعبِ ابی طالب میں محروس ہے۔ عام الحزن بھی ہے، وادی طائف میں غم واندوہ کی معراج بھی ہے۔

میں نے ابتداء میں عرض کیا تھا کہ عبدہٗ ورسولہٗ کی اس شہادت کے ساتھ ان دو پہلوؤں کے درمیان باطنی اتحاد ورابطہ، تطبیق وتوافق کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس ربط کو سمجھنے میں عصری اسلامی فکر میں اقبال ہمارا ساتھ دیتے ہیں وہ پانچویں خطبہ میں کہتے ہیں نبوت کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ یہ شعور ولایت کی وہ شکل ہے جس میں واردات اتحاد (یعنی روحانی تجربہ) اپنے حدود سے چھلک کر ان قوتوں اور وسائل کو بروئے کار لاتا ہے جو حیات اجتماعیہ کی صورت گر ہیں گویا انبیاء کی ذات میں زندگی کا متناہی مرکز، لامحدود اعماق میں ڈوب جاتا ہے تو اس لئے کہ پھر ایک تازہ قوت اور توانائی سے ابھر سکے۔ وہ ماضی کو مٹانا اور پھر زندگی کی نئی راہیں اس پر منکشف کر دیتا ہے، معراج کے سلسلہ میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے ایک قول کو پیش کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ روحانی تجربہ کے بعد نبی کی باز آمد یا مراجعت تخلیقی ہوتی ہے، وہ اس واردات روحانی سے واپس آتا ہے تو اس لئے کہ زمانہ کی رو میں داخل ہوجائے اور ان قوتوں کے غلبہ وتصرف سے جو تاریخ عالم کی صورت گر ہیں مقاصد کی ایک نئی دنیا آباد کرے۔

عبد کاملؐ کے ان لمحات پر نظر ڈالئے جب روح پاک عالم قدس میں پہنچنے کو ہے، سانسوں کی خرخراہٹ کے درمیان لب مبارک کو جنبش ہے، فدائیان رسول قریب پہنچ کر آواز سنتے ہیں، ''الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم ''یعنی وقت وداع بھی ان دو پہلوؤں کا اظہار ہے۔ ایک طرف صلوٰۃ کی تاکید ہے جو عبودیت کا اعلیٰ ترین اظہار ہے، مومن کی معراج ہے۔ دوسری طرف ان لوگوں کے حقوق ادا کرنے کی تاکید ہے جن پر آپ کو غلبہ حاصل ہے، آخری الفاظ رفیق الاعلیٰ کے ہے عبد کاملؐ کے لئے رفیق اعلیٰ سے بڑھ کر کون سی رفاقت ہوسکتی ہیں۔ میں نے ابتداء میں یہ بات بھی عرض کی تھی کہ عبدیت اور رسالتِ محمدیہ کی شہادت دیتے ہوئے ہم بہ حیثیت شاہد ایک ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ ایک طرف

تو عبدہٗ کی پیروی میں روحانی اور اخلاقی کمالات کا نہ ختم ہونے والا سفر ہے۔ ذوق وشوق و بندگی ہے تو دوسری طرف رسولہٗ کی گواہی کے بعد ہم اپنے عصر، اپنے معاشرہ، اپنے ماحول سے بیگانہ اور بے نیاز نہیں رہ سکتے اس شہادت کا تقاضا ہے کہ ہم خیر کی جستجو میں عالم انسانیت کے بہتر مستقبل کی صورت گری کے لئے ایک فعال قوت بن جائیں، ایک مشہور صوفی بزرگ کا یہ قول غور وفکر کا طلب گار ہے کہ سالک، مقاماتِ سلوک طے کرنے کے بعد مخلوق کی طرف مامور من اللہ ہو جاتا ہے سوال یہی اہم ہے کہ روحانی پیشوائی کا دعویٰ کرنے والوں کے سامنے اللہ کی طرف سے مخلوق کی جانب ماموریت کا تصور کس حد تک مستحضر ہے۔ آج ہماری ملی زندگی کا المیہ یہی ہے کہ ایک طرف تو ایمان اور یقین کی باتیں ہیں کمالات اور کرامات کے تذکرے ہیں لیکن جہانِ مکافات عمل کو اوروں کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ شائد اِسی پس منظر میں اقبال نے کہا

یہ حکمتِ ملکوتی یہ علمِ لاہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ایک طرف ملّی قیادت کا دعویٰ کرنے والوں کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جن کی نظروں سے اظہار عبودیت کے تقاضے اوجھل ہیں خوفِ خدا، اخلاص، بے نفسی کی کیفیت نہیں ملتی، للّٰہیت نہ ہو تو ہم اپنی ہوائے نفس کو اپنا معبود بنا لیتے ہیں، جماعتیں بت بن جاتی ہیں، مفاداتِ حاصلہ ہمارا مقصود بن جاتے ہیں اور ہم اپنے نفس کے مغالطوں کا شکار ہو کر اپنے مقصد سے دور ہو جاتے ہیں، مرضیٔ الٰہی کو نظروں سے اوجھل کر دیتے ہیں اخلاص اور بے نفسی کے بغیر مخلوق کی خدمت کا دعویٰ خود نمائی، شہرت پسندی اور ہوائے نفس کی پیروی کے سوا کچھ اور نہیں۔

اسی طرح روحانی کمالات اور پیشوائی، تعلق مع المخلوق سے کٹ کر شاید رہبانیت ہی قرار دی جاسکتی ہے، خلوت کا سرور اگر جلوت سے بے نیاز کر دے، اگر مراقبہ ہی مقصود بن جائے اور مجاہدہ سے سروکار نہ رہے تو گویا ہم رسولہٗ کی شہادت کے تقاضوں سے غفلت کا شکار ہو رہے ہیں، جمال وفقر شانِ عبدیت کا فیض ہے اور جلال وغلبہ شان رسالت سے مستنیر ہے۔

فقر وشاہی واردات مصطفیؐ است
ایں تجلی ہائے ذاتِ مصطفیٰ است
ایں دوقوت ازوجودِ مومن است
ایں قیام وآں سجودِ مومن است

سجدہ میں جمال بندگی ہے اور قیام جلال کبریائی کا مظہر ہے ،اگر وقتِ قیام ہم سجدہ میں گر جاتے ہیں تو گویا ہم عالم انسانیت سے کٹ جانے کی غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں اور قیام کی استقامت اور جلال کے بغیر سجدہ شاید سر بزیری بن کر رہ جاتا ہے۔ حرا کی خلوتوں سے لے کر فاران کی چوٹی پر نعرہ حق تک، خودی سے بے خودی تک مختلف منزلوں اور مراحل کی نشاندہی اقبال نے کمال بلاغت سے یوں کی ہے۔

اندکے اندر حرائے دل نشین
ترکِ خود کن سوئے حق ہجرت گزیں
محکم از حق شو سوئے خود گامزن
لات وعزائے ہوس را سرشکن
لشکرے پیدا کن از سلطان عشق
جلوہ گر شو برسرِ فاران عشق
تاخدائے کعبہ بنوازد ترا
شرحِ ''انّی جاعلٌ'' سازد ترا

غرض ہمارے انفرادی اور اجتماعی تقاضوں کی تکمیل اسی وقت ہوسکتی ہے۔ جب حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی کی عبدیتِ کاملہ اور رسالتِ کاملہ کے دونوں پہلو ہمارے سامنے ہوں اور ہنما روحانی اور تاریخی ابعاد اور ان کے درمیان ربط اور تطبق کے رمز شناس بن سکیں

خودی کی خلوتوں میں کبریائی
خودی کی جلوتوں میں مصطفائی

مطبوعہ سوویز ۱۹۸۶ء

☆☆☆

کیلاش کنول

(تراجم از ''پیام مشرق'' حسب اجازت علامہ اقبال)

(ماخوذ از جریدہ ہمایوں، مارچ، اگست، نومبر ۱۹۳۸ء)

مقبول احمد پوری، لاہور

فارسی متن	اُردو ترجمہ
دما دم نقش ہائے تازہ ریزد	پل پل، نئی نئی، ریکھائیں(۱)
بیک صورت قرارِ زندگی نیست	بیاکل اِس جیون کو بنائیں
اگر امروز تو تصویرِ دوش است	چِتر جو کل کا ہے آج بھی تیرا
بخاک تو شرارِ زندگی نیست	آگ نہ راکھ میں تیری پائیں

۱ نقوش 2 تصویر

چو ذوقِ نغمہ ام درجلوہ آرد — اپنی سبھا میں ہوں ڈالتا ہلچل
قیامت افگنم درمحفلِ خویش — دُھن جو کبھی سنگیت میں لاتی
چو می خواہم دمے خلوت بگیرم — چاہوں اکیلے رَہَن کو جو دم بھر
جہاں راگم کنم اندردلِ خویش — یہ دُنیا دل میں کھو جاتی

چہ می پُرسی میانِ سینہ دل چیست — پُوچھتے کیا دِل تن میں کیا ہے؟
خِردچوں سوز پیداکرد دِل شُد — پریت سے گیان تپا تو بنادِل
دل از ذوقِ تپش دل بود لیکن — یہ دل اسی تپَن تک دِل تھا
چویک دم از تپش اُفتاد گلِ شُد — تج کے تپَن متی میں گیا مِل

فارسی متن	اُردو ترجمہ
نہ پیوستم درین بُستاں سرا دل	دِل نہ لگاؤں اس اُپون* سے
زبندِ این وآن آزادہ رفتم	دُور رکھوں یہ، وُہ، سب من سے
چو بادِ صُبح گردیدم دمے چند	جیسے ہوا، میں آؤں سویرے
گُلاں را آب ورنگے دادہ رفتم	رنگ دوں پھولوں میں، جاؤں چمن سے

(*) اُپون معنی باغ مراد عالم

شنیدم درعدم پروانہ می گفت	سُنا کہے تھا پتنگ عدم میں
دَمے از زندگی تاب و تَم بخش	دم بھر کو جیون کی تپن دے
پریشاں کُن سحر خاکسترم را	چاہے اُڑادے راکھ سویرے
ولیکن سوزد سازِیک شبنم بخش	رَین تو آگ سے بھر تن من دے !

بہ کویش رہ سپاری اے دل اے دل	راہ اُسی کی لگا آہ اے دل
مراتنہا گذاری اے دل اے دل	چھوڑے کے مجھ کو چلا آہ اے دل
دَمادم آرزُوہا آفرینی	آس پہ آس اُبھاری من میں
مگر کارے نداری اے دل اے دل !	کام نہ اور تھا کیا آہ اے دل

ترا از خویشتن بیگانہ سازد	تجھ کو جو آپ سے آپ بھُلا دے
من آں آبے طربناکے ندارم	پاس رکھوں نہ وہ من موجی[1] رس
ببازارم مجو دیگر متاعے	میری دُکان میں اَور نہیں کچھ
چو گُل جُز سینۂ چاکے ندارم	پھول سے ٹوک[2] ہیں دِلکے اور بس !

طربناک، نشہ آور۔ ۲۔ بروزن بھوک معنی ٹکڑے

فارسی متن	اُردو ترجمہ
زیاں بینی زسیر بوستانم	میرے چمن میں نہ پائے تو آنند
اگر جانت شہیدِ جستجُو نیست	کھوج نہیں جو ترے جیون میں
نمایم آنچہ ہست اندررگِ گُل	بھید بتاؤں میں پُھول کی رَگ کا
بہارِ من طلسمِ رنگ وبُو نیست	رنگ کو لاؤں نہ باس کو من میں !
تُرا یک نُکتہ سربستہ گویم	تُجھ کو بتاؤں میں ایک چھپا گُر
اگر درسِ حیات ازمن بگیری	جیون پاٹھ[1] جو تو پڑھ جائے
بمیری گر بہ تن جانے نداری	جان[2] بنا تن ہو تو مرے تُو
وگر جانے بہ تن داری نمیری	تن میں ہو جان تو موت نہ آئے
بروں از ورطۂ بود و عدم شو	بھاؤ[1] اَبھاؤ کے گھیر سے باہر
فزوں ترزیں جہانِ کیف و کم شو	پُور[2] اَپُور جگت سے اُوپر
خودی تعمیر کُن در پیکرِ خویش	اپنے سُروپ کو ڈھال لے پریمی
چو ابراہیم معمار حَرم شو!	اِس جیون آکار[3] کے بھیتر

۱۔ سبق، ۲۔ جان یعنی عزم وہمت

۱۔ بھاؤ، معنی عدم، ابھاؤ یعنی وجود، پور معنی پورا، اپور معنی ناتمام۔ ۳۔ جیون آکار یعنی پیکر حیات

☆☆☆

خبرنامہ

اقبال اکیڈیمی کے اجتماعات

۱۔ ۲۰/اپریل ۲۰۰۸ء

یوم اقبال

مقررین	موضوعات
۱۔ پروفیسر محسن عثمانی ندوی	"روح اقبال": ایک مطالعہ
۱۔ پروفیسر عقیل ہاشمی	اقبال کا مذہبی شعور
۳۔ جناب محمد ضیاء الدین نیر	اقبال اور حیدرآباد

صدارت: جناب محمد ضیاء الدین نیر۔ نائب صدر اکیڈیمی، نظامت وکلام اقبال جناب سید امتیاز الدین معتمد اکیڈیمی

۲۔ ۱۹/جولائی ۲۰۰۸ء

توسیعی تقریر: جناب محمد ظہیر الدین صدر اکیڈیمی

موضوع: ختم نبوت کے مضمرات۔ اقبال کی نظر میں

صدارت: جناب محمد عبدالرحیم قریشی صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت وسکریٹری مسلم پرسنل لا بورڈ

کلام اقبال۔ جناب سید امتیاز الدین

نظامت: جناب محمد ضیاء الدین نیر

کتب خانہ۔

کتب خانہ میں اضافہ کا سلسلہ الحمدللہ جاری ہے۔ چنانچہ اس ششماہی میں اقبال اکیڈیمی پاکستان کے نئے شمارے ''اقبال ریویو'' (انگریزی) اور ''اقبالیات'' کے علاوہ چار اہم کتابیں موصول ہوئیں۔ جن میں قابل ذکر خطبات اقبال، تسہیل وتفہیم شامل ہے۔ مرکز تحقیقات فارسی ایران (پاکستان) سے فارسی میں دو اہم کتابیں ''گلشن راز، تصحیح انتقادی ومطالعہ'' اور ''حافظ شناسی'' موصول ہوئیں اس کے علاوہ جن ہمدردوں نے کتابیں مرحمت فرمائی ہیں ان میں جناب

محمد عبدالرحیم قریشی ۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل (وزیٹنگ پروفیسر جاپان) پروفیسر محمد علی اثر وغیرہ شامل ہیں۔

کتابوں کی فہرست سازی وجلد بندی

اس ششماہی میں جملہ **407** قدیم اور اہم جرائد اور **217** کتابوں کی جلد بندی کروائی گئی۔ کتابوں کی تہذیب اور فہرست سازی کا کام اکیڈیمی کے قدیم اور مخلص رفیق جناب سید محمود قادری اعزازی طور پر انجام دے رہے ہیں۔

کلام اقبال کے نئے تراجم

ا۔ ترجمہ اسرار ورموز: جناب سید احمد ایثار، آئی ایف ایس (بنگلور) نے اسرار خودی اور رموز بیخودی کا منظوم اردو ترجمہ مع متن، جو حال ہی میں شائع ہوا ہے، روانہ فرمایا ہے۔

یہ ترجمہ ایثار صاحب کے اعلیٰ علمی ذوق اور انہماک کا آئینہ دار ہے۔ موصوف نے اقبال کے فارسی کلام کے تمام مجموعوں کا ترجمہ کیا ہے جو شائع ہو چکے ہیں۔ ارمغان حجاز کا ترجمہ زیر طبع ہے۔ جناب سید احمد ایثار کی خدمات کے بارے میں ایک مضمون سابقہ شمارہ (اقبال ریویو، اپریل ۲۰۰۸ء) میں شائع ہو چکا ہے۔

ب۔ بانگ درا کا جاپانی ترجمہ۔ ممتاز جاپانی نژاد اردو اسکالر پروفیسر ہیروجی کٹاوکا (Prof Hiroji Kataoka) نے جاپانی زبان میں بانگ درا کا ترجمہ کیا ہے۔ اس ترجمہ کی ایک کاپی کتب خانہ اقبال اکیڈیمی کے لئے خود پروفیسر کٹاؤکا نے مرحمت فرمائی۔ جس کے لئے اکیڈیمی موصوف اور پروفیسر معین الدین عقیل کی ممنون ہے۔

☆☆☆

IQBAL REVIEW

NOVEMBER 2008

English Section

Dr.Tariq Masoodi

Some Aspects of Iqbal's Educational Thoughts

Dr.Tariq Masoodi
lecturer Education Dept
Maulana Azad National
Urdu University , Hyderabad.

Some Aspects of Iqbal's Educational Thoughts

Educationists use the word" Education" in two senses. In its broader sense it designates all the influences like physical, biological, ethical and social, which formulate the course of life of an individual and the nation, and, in the narrower sense it goes on within the four walls of learning on conventional pattern. In any way, however , education is all embracing process and influences all aspects of the life of the Educated. Strength of the nation depends on its concept of education .

In this perspective Allama Iqbal, as a creative thinker, catches our imagination.In his critical and intelligent study of numerous subjects and issues concerning man and society, he expressed his Ideas in the background of issues raised by the dominance's of science and technology. As a versatile genius and visionary he remained in perpetual quest for a perfect man. He introduced the doctrine of "Khudi" in a unique way as the real and significant basis of life. The ideal of "Khudi" constitutes an overall objective in his philosophy of education. Iqbal sees the essential role of education in the development of originality, spirit of social orientation and preservation of cultural heritage. He further defines his viewpoint in these words.

"Education like other things ought to be determined by the needs of the learner. A form of education which has no

direct bearing on the particular type of character which you want to develop is absolutely worthless. I grant that the present system of education in India gives us bread and butter. We manufacture a number of graduates and then we have to send titled mendicants to Government to beg few appointments in the higher branches of service. What than? It is the masses who constitute the backbone of the nation. They ought to be better fed, better housed and properly educated. Life is not bread and butter alone.It is a healthy character reflecting. The national ideal in all its aspects something more and for a truly national character , you ought to have a truly national education.

It is true that Iqbal has not put forward any specific educational technique or methodology. Yet ,his educational ideas surely do have practical implications. Iqbal has propounded his views on divergent dimensions of educational activity viz school, curriculum, teacher, method of teaching, discipline etc. He had the ambition to have an up to date time-honored system of education, replacing the system of uncompromising character. Iqbal belongs to a specific class of scholars of Muslim history who in their ideas education attempted to reconnect the broken links of varied aspects of education in an organic whole. In this connection, the educational ideas of Iqbal seem in harmony with the ideas of Al -Ghazzali(1058-1111),(Ibn -I -Khaldoon) (1332-1404), Shah Walliullah (1702-60), Mufti Muhammad Abduhu (1842-1905)Maulana Abul Kalam Azad (1888-1958) and others.

Before the advocacy of his philosophy of life, he took interest in the contemporary systems of education in the Indian

sub-continent. He visualized a state of divergence between what existed already and what was introduced by the British. His first paper on education entitled "Bachoon Ki Taleem-o-Tarbiyat" was published in Makhzan june, 22 1902. In it , he had formulated eleven principles of instructional technique based on the sound principles of psychology[2] he sees the role of ideal teacher in the purview of Sheikh Sadi's famous Persian couplet.

خشتِ اول چوں نہد معمار کج تا ثریا می رود دیوار کج

"If the mason lays his first brick wrongly, the entire wall will remain infirm."

After his return from Europe, he delivered a lecture in Aligarh on the topic "Islam as a social and political ideal. In this lecture he suggested the concept of an ideal university. His eagerness for compulsory education could be understood in the light of an important event in 1912 . A senior leader of the Indian National congress Gopal Krishna Gokhley submitted a resolution of forcible and compulsory education for all in the imperial legislative council .It generated discussion on wide ranging issues in educational and literary circles of India. Iqbal presided over a similar gathering in Islamia college Lahore. The word 'Jabri'was the center of discussion. In this meeting various Muslim scholars disagreed with the resolution and considered it as un Islamic .In his presidential address , Iqbal fully endorsed the resolution and declared it as smallpox vaccination against illiteracy and termed it in accordance with the spirit of Islam. In the constructional process of Jamial Millia Islamia , he repeatedly made appeals for donations and maintained that all those who would associate with this noble

mission would be the educational crusaders. Iqbal initiated correspondence with Sahebzada Aftab Ahmed Khan and Sir Masood, vice Chancellors of Muslim University Aligarh and made recommendations about syllabus of graduate and post graduate classes and had discussed in detail the qualities of an ideal university teacher. These recommendations reveal Iqbal's wide knowledge of different aspects of academic importance. He took keen interest in the compilation of text books for post elementary classes. An Urdu textbook titled Urdu course "for 7th class students (published by Gulab Chand Kapoor and sons book sellers and publishers Anar Kali, Lahore, 1924) speaks Iqbal's perception of curriculum. In its introduction he has out lined essential features of purposeful curriculum. Allama gets his view point confirmed from his own Urdu couplets.

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن جس شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصود ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

"O, men of vision, it is good to have an eye for beauty; but what is the eye that fails to grasp the reality of things .

Art yearns for immortal life,

What good is existence for a breath or two like a spark."

On the invitation of king Nadir Shah of Afganistan in 1933 , Iqbal along with Sir Ross Masood and Maulana Syed Suliman Nadvi visited Kabul for proposed educational planning of that country .In his poetic collection "Zarb-e-Kaleem (1936) , he devoted one part of it for education.

During his observation of educational situation, two systems of education were in vogue in the world of Islam in general and in the Indian sub-continent which had remained

unchanged and took no cognizance of the new changes and developments. The other was the exclusive western and modern system endeavored by Sir Syed Ahmed Khan at Aligarh. Iqbal was dissatisfied with both. Taking critical view of the whole situation he resented whole sale acceptance and adoption of western system of education on the part of the people in the East. He subjected its inadequacies and its negative influences on the people of Indian sub -continent. Who according to Iqbal are losing roots in their cultural heritage. But he appreciated the scientific and technological advancement brought out by the west.

He makes his idea clear to the Eastern people that strength and prosperity of the west is not the out come of her music nor of her dances or their unveiled daughters. But their power and vitality springs out of her knowledge and sciences. Similarly he showed absolute dissatisfaction with the educational role of conventional Muslim educational centers. For Iqbal , these institutions lack in fulfillment of current aspirations of Muslim society. Stagnation in religious thinking and lack of insight in the contemporary national and international issues, asserts Iqbal are mainly the result of unquestioning acceptance of theology. This approach finds Iqbal affected by over all contribution of religion. He visualizes the essential role of religion as:

"Religion which in tis higher manifestation is neither dogma, nor priest hood, nor ritual , can alone ethically prepare the modern man for the burden of the great responsibility here and retaining it here after." 8

Dr: Radhakrishan is in full agreement with Iqbal when he explains the essence of religion the following words.

Re!igion is not mere dogmatic conformity . it is not question of ceremonial piety. It is not merely going through a ritual prescribed to us. It is remaking of our own self , the transformation of our nature . "9

Iqbal formulated his educational perception on the basis of happy amalgam of religion and science in the curriculum . Amalgamation of such a system of education considered by Iqbal is necessary for producing the ulema of broader vision, who certainly would contribute their insight in exploring the burning issues of humanity and particularly of Muslim Ummah. Iqbal held the view that the ulema and preachers of today are not in a position to deliver the goods, because their knowledge with regard to Islamic learning and history is narrow and restrictive. Iqbal speculates the educative role of ulema and preachers. He suggested that ulema must be acquainted with the knowledge of history, economics, sociology, besides of Islamic literature.10

It is pertinent to mention here that Iqbal in his writings praises the intellectual integrity of ulema of high repute. He exalts Shah Waliullah (1702-60)

As a man of deep insight "broad vision and great theologian, Iqbal was never ashamed off seeking guidance and inspiration from such ulema. In one of his articles, A plea for deeper study of Muslim Scientists Published in the Islamic culture, Hyderabad Daccan, April 1929 , he refers his association with Allama Anwar Shah Kashmiri (1875-1933)in these words

One of the most important concepts of modern mathematics reminds the extent of possibility in the science of space -Ed.I.C) of Iraqi.

During my correspondence with Moulvi Syed Anwar Shah, one of the most learned traditions in the Muslim world of today regarding the meaning of word Dahr""(Time), occurring in the well known tradition. Deal not in invective against time (with time's vicissitude's, time (with time's vicissitudes)Lo, Time (with vicissitudes) is Allah . Ed.I..C.) The Moulvi Sahib refered to this manuscript, and later , at my request, very kindly sent me a copy of it. I consider it necessary to give you an account of the contents of this valuable document, partly because it will furnish aditional reason for disatisfaction with Spengler's theory, but mainly because I mean thereby to impress upon you the need of oriental research in the concepts of special sciences as developed in the world of Islam. Moreover it is likely that this small manuscript of great value may lead to the opening up of a fresh field of inquiry about the origins of our concepts of space and time, the importance of which has only recently been released by modern physics .11

Iqbal held the view that the Qruran repeatedly lays much emphasis on empirical aspect of knowledge.12 .It was a constant and a favorite prayer of the Prophet of Islam (PBUH) اللهم ارنا حقائق الاشياء كما هى(God grant me knowledge of the ultimate) nature of things . Iqbal asserts that reality of things could be ascertained through observation and experimentation, which is called . inductive reasoning 13 in science scientific terminology. Thus, he imagines an educational institution which should have the emphasis on both science and religion. In a letter to Mahatma Gandhi in 1920, he suggests.

A separate institution mainly devoted to the technical side of natural sciences supplemented by such religious

education may be considered necessary. 14

In his ideas of education he vehemently emphasizes development of creativity which he avers, is the highest attribute of man and links him with God. Iqbal is an enthusiastic advocate of the significance of activity and creativeness of life. Iqbal believes that not man by nature but even God is active in order to be creative. (busy every moment in creating new things) Iqbal's conception of true dynamic youth is an apostle of desires and visionary of new horizons .He, therefore , wants that education should aim at arousing, sustaining and perpetuating the quest of desires, among students . New purposes and desires affirms Iqbal, could not be stimulated in a vacuum, but through meaningful, positive and creative interaction with the multi-dimensional environment. When Iqbal in his philosophy6 stresses, the supremacy of man over forces of nature, science naturally assumes prominent place in the system of education. He therefore disagrees with the contention of naturalist. Who consider an adjustment to the environment as the educative goal. Iqbal held that not adjustment but the conquest of the environment is the real aim of education. Iqbal draws a fine picture of conquest of nature by man through his consistent and restless creative activity.

In the deep-silence of the heart burning desire. Nature build only dunes of sand The heaven bow in reverence to the grandeur pyramids

"Which have drawn this picture of immortality."

The core of Iqbal's educational ideas is doubtless Islamic in origin, but what singles him out, is his attempt at synthesizing with whatever he found of value elsewhere. It is quite apparent

from his ideas that he intend to have a healthy dialogue between the East and West. He analyzed and highlighted the conflict between these two civilizations. Iqbal never missed any opportunity in pointing out defects of the west but he did not seem to be harboring any hatred for the west . instead he provided a bridge between the East and West, While supplementing the Eastern listlessness by the Western dynamism, enriching Western materialism by Eastern spiritualism.

"In the west the essence of life is the intellect,
In the East the basis of life is , love .
Through love intellect grows acquainted with Reality.
And intellect gives stability to the world of love
Arise and lay the foundation of new world by wedding intellect to love."

Iqbal is primarily a thinker of merits . His hope and confidence in man never shattered his will and vitality . After a dark night, fresh dawn matters to him.

"Be not displeased with East nor refrained with West.
It is nature's demand to turn every night in to a dawn."

☆☆☆

References:

1. *Speeches and Statements of Iqbal,.p.96*
2. *Shakeel, Abdul Gaffar, Iqbal Kay Nasri Afkar.P.18.*
3. *Speeches and Statements of Iqbal, P.101.*
4. *Fatehpori, Farman, iqbal sab kay liey, P.104*
5. *Ibid,P.106*
6. *Hussain, s . unpublished letters of Dr. Iqbal. Kashmir times Jammu, April 17,1994*

7. Javied Nama, p.208.
8. The Reconstruction of Religious Thought in Islam P.189.
9. Sidiqi Nazeer , Iqbal And Redhakrishnan, P.2
10. Sidiqi, B.H, Iqbal Bahiysiyat-I- Mufakiri Taleem,P.30.
11. Speeches and Statements of Iqbal ,P.136
12. The Reconstruction of Religious Thought in Islam, P.15
13. Speeches and Statements of Iqbal, P.91
14. Kuliyat-I-Iqbal,P 485.
15. Javied Nama, P.91
16. Kuliyat-I-Iqbal , P.136
17. The Reconstruction P.126

☆☆☆

Vol: 17 Issue :2
November 2008

ISBN : 81-86370-39-0
Phone : 6666 3950

(JOURNAL OF THE IQBAL ACADEMY HYDERABAD)

NOVEMBER 2008

"IQBAL REVIEW"

IQBAL ACADEMY

Gulshan-e-Khaleel, Masab Tank,Hyderabad-28, A.P., INDIA